آدمی اور انڈے

موپاساں

مترجم

تاجور سامری

پیش لفظ

یُوں تو دُنیا کے کہانی کے ادب میں اَن گِنت لکھنے والوں نے اپنے اپنے دَور میں قابل قدر اضافے کیے ہیں اور اب تک جاری ہیں۔ لیکن وہ مصنّف جن کی نگاہ گہرائیوں میں اترنے والی اور دل انسان کی محبت سے گرم اور اس کے دُکھوں سے غمگین ہے۔ ان میں دو نام ٹالسٹائے اور چیخوف کا نام آتا ہے۔ ٹالسٹائے نے اپنے عظیم و ضخیم ناولوں "امن اور جنگ اور انیا کرینینا" کی وجہ سے زیادہ شہرت پائی۔ اس کی کہانیوں کی حیثیت دُوسرے درجے پر ہے۔ چیخوف نے زیادہ تر کہانیاں لکھی ہیں۔ مختصر مگر عظیم۔ سادہ مگر روشن اور جیتی جاگتی انسان کے دکھ اور جدوجہد کی تصویروں کے ساتھ لٹریچر کے طبقوں نے کھوکھلے پن کو بھی ان کہانیوں کو ابھارا گیا ہے!

چیخوف کے علاوہ ایک افسانہ نویس اور ہے۔ جو اس سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ ہے موپاساں (موپساں)۔ موپاساں کی عالمگیر شہرت اور مقبولیت بھی اس کی سادہ مگر

دلکش اور مختصر کہانیوں کی وجہ سے ہے۔ اس کا دل انسان کی محبت سے بھرپور اور اس کے دکھ سے دکھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اوپر کے طبقوں کے کھوکھلے پن سے شدید نفرت بھی کم نہیں۔ وہ جہاں انسان کی مصیبتوں پر روتا ہے۔ وہاں طبقے کے نفرت انگیز کھوکھلے پن پر زہریلے قہقہے بھی لگاتا ہے اور اسی جوش میں اس کا ریشمی لباس نوچ کر اس کی کوڑھ ماری ذلیل عریانی کو منظرِ عام پر لے آتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے موپاساں کے افسانوں میں جنسی بے راہ وردی کا شبہ ہونے لگتا ہے درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اس کی بے نقاب کرنے کی کوشش میں تلذّذ کو کہیں بھی دخل نہیں۔ پڑھنے والا اس کی کہانی پڑھ کر اس ماحول یا کردار سے اتنی ہی نفرت کرنے لگتا ہے جتنی کہ موپاساں کے دِل میں تھی۔

اس مجموعے "آدمی اور انڈے" میں موپاساں کے چند افسانے اُردو کا لباس پہن کر منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی دو مجموعے آ چکے ہیں۔ لیکن اس کے افسانے سبھی نئے ہیں۔ یوں تو موپاساں کی ہر کہانی خوبصورت ہوتی ہے۔ لیکن "آدمی اور انڈے" کا ہر افسانہ اپنی جگہ اہم دلچسپ اور اس مرتے ہوئے نظام پر ایک بھاری اور کاری ضرب ہے۔ مترجم اپنی کوشش میں کامیاب معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایسی زبان استعمال کی ہے۔ جس کو پڑھنے والا سمجھ سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ افسانے اصل کی رُوح کا بہت سا حصّہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ بجائے خود جو ایک بہت بڑی بات ہے۔ میرا خیال ہے۔ اس مجموعے کا گرم جوش خیر مقدم کیا جائیگا!

دہلی
مارچ ۱۹۵۵ء

تاجور سامری

A Son without Father

توحید گنج بارہمولہ کشمیر
۲۳ دسمبر ۸۶ء

بے باپ کا بیٹا

چھٹی کی گھنٹی بجی ۔ جونہی اسکول کا پھاٹک کھلا ۔ لڑکے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے جلد سے جلد اسکول چھوڑنے کی کوشش میں آپس میں دھکے دیتے ہوئے باہر نکل پڑے ۔ معمول کے مطابق ان کے ناشتے پانی کا وقت ہو چکا تھا ۔ لیکن بجائے گھروں کے رخ کرنے کے وہ دو دو چار چار کر کے اکٹھے ہو گئے ۔ اور آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے ۔

بات یہ تھی ۔ کہ اس روز مس لا بلانشوت کا لڑکا سیموں پہلی بار سکول آیا تھا ۔ ان سب لڑکوں نے اپنے اپنے گھروں میں مس لا بلانشوت کا ذکر سنا تھا ۔ عوام میں تو وہ کافی شناسا تھی ۔ لیکن گھروں میں ان کی مائیں بڑی حقارت سے اس کا ذکر کرتی تھیں ۔ اور ان کی شناسی لڑکوں نے بھی بغیر کچھ جانے بوجھے اس کو ذلیل سمجھنا شروع کر دیا تھا ۔

سیموں کو وہ سب جانتے بھی نہ تھے ۔ کیونکہ نہ تو وہ کبھی گاؤں کی گلیوں میں ان کے ساتھ کھیلنے کودنے آتا تھا ۔ اور نہ دریا کے کنارے ۔ یہی وجہ تھی ۔ کہ

سیموں ان کو بالکل پسند نہ آیا۔ وہ سب کچھ تو حیرت سے اور کچھ دلچسپی سے ٹولیاں بنا بنا کر اس کا ذکر کرنے لگے۔ ان میں سے ایک تیرہ چودہ برس کا لڑکا بڑے راز دارانہ لہجے میں اپنی اہم معلومات کا سکہ جمانے کے لئے آنکھ مٹکاتے ہوئے کہہ رہا تھا ——
"تم لوگ کچھ جانتے بھی ہو۔ سیموں کا کوئی پاپا نہیں ہے۔ اس کے باپ کا پتہ نہیں ہے"۔

اتنے میں مس لابلانشوت کا لڑکا سیموں بھی پھاٹک سے باہر نکل آیا۔ اس کی عمر سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور چال ڈھال سے ذرا ڈرپوک دکھائی دیتا تھا۔

وہ چپ چاپ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ کہ لونڈوں نے اس کو چاروں طرف سے ستانے اور تنگ کرنے کی خاطر گھیر کر نرغے میں لے لیا۔ وہ کچھ گھبرایا سا۔ کچھ پریشان سا ان کے درمیان گھرا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس لڑکے نے جس نے یہ خبر سنائی تھی۔ اکڑتے ہوئے اس سے پوچھا —— "کیوں بے تیرا نام کیا ہے؟"
اس نے جواب دیا۔ "سیموں"۔

"بس سیموں —— اور آگے؟" —— دوسرے لڑکے نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

بچّہ نے گھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "سیموں"۔

ایک لڑکے نے چلا کر کہا —— "تمہارے نام کے آگے تمہارے باپ کا نام ہونا چاہیئے۔ صرف "سیموں" تو کوئی نام نہیں ہے"۔

آنسو بھری آنکھوں سے بچّے نے پھر کہا —— "میرا نام سیموں ہی ہے"۔

لڑکوں نے زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اس لڑکے نے جس نے

سب سے پہلے یہ خبر سنائی تھی۔ بڑے فخر سے گردن اٹھاتے ہوئے کہا ـــــ "دیکھا تم لوگوں نے! میں کہتا تھا نا کہ اس کا کوئی باپ نہیں ہے"!

پھر لڑکوں پہ ایک خاموشی طاری ہو گئی۔ اور وہ اس عجیب و غریب بے باپ کی پیدا شدہ اولاد کو بڑے غور سے دیکھنے لگے۔ جیسے وہ قدرت کا کوئی عجیب و غریب کرشمہ ہو۔ ان کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کہ کاش! ان کی اپنی ماؤں کی ہمدردیاں بھی مس لا بلانشوت کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ سیموں ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ وہ کہیں گر نہ جائے۔ وہ بالکل گم صم کھڑا تھا۔ جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ وہ کچھ تشریح کرے اور یہ بتلانے کی کوشش کرے کہ وہ بے باپ کی اولاد نہیں ہے۔ لیکن اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ آخر کار سوچتے سوچتے یکایک اس نے چلا کر کہا "ہاں ہاں میرا باپ ہے"!

لڑکوں نے حیرت سے پوچھا ـــــ "کہاں ہے"؟

سیموں پھر چپ ہو گیا۔ وہ خود ہی نہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کون تھا اور کہاں تھا۔

لڑکوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اتنے میں سیموں کی نظر اپنے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک بیوہ کے لڑکے پر پڑی۔ جو اس کی طرح ہمیشہ اپنی ماں کے ساتھ اکیلا ہی دکھائی پڑتا تھا۔ اس نے اس لڑکے سے کہا ـــــ "اور تمہارا بھی تو باپ نہیں ہے۔ کہاں ہے تمہارا باپ؟

"ہے کیوں نہیں" اس نے جواب دیا۔

"کہاں ہے؟" سیموں نے پوچھا۔

بڑے فخریہ انداز میں گردن اٹھا کر اس نے کہا ——— "قبرستان میں ہے میرا باپ۔ وہ مر چکا ہے۔"

سارے لڑکوں نے بڑے زور سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ جیسے کم سے کم ان کے دوست کے باپ کی قبرستان میں موجودگی اس لونڈے کو نیچا دکھانے کے لئے کافی تھی۔ جس کا سرے سے کوئی باپ ہی نہ تھا۔ اس وقت سارے لڑکے غرور کے مارے سیموں کے اوپر اس طرح جھکے جا رہے تھے۔ جیسے اپنی جائز ولادت کے بوجھ کے تلے اس ناجائز اولاد کو پیس کر رکھ دینگے۔ گو ان میں سے بہت سے بچوں کے باپ پورے درجے کے شرابی۔ آوارہ اور بدمعاش تھے اور ان کی خوب ٹھکائی بھی کرتے تھے۔ سیموں کے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک لڑکے نے زبان نکال کر چڑاتے ہوئے کہا ——— "اس لونڈے کا کوئی باپ نہیں ہے۔ اس کا کوئی پاپا نہیں ہے۔"

سیموں نے غصے میں دونوں ہاتھوں سے اس کے بال پکڑ لئے اور لات گھونسے چلانے لگا۔ اس لڑکے نے اس کے گالوں پر دانتوں سے کاٹ لیا۔ دونوں میں کشتم کشتا ہونے لگی۔ دوسرے لڑکے بھی اس لڑائی میں شریک ہو گئے اور بیسیوں نے مشترکہ محاذ بنا کر سیموں کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اور گھسیٹ گھسیٹ کر اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ کچھ لڑکے حلقہ بنائے ہوئے خوشی سے تالیاں پیٹ رہے تھے اور لڑائی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ آخر جب وہ خوب پٹ چکنے کے بعد گرد جھاڑتے ہوئے زمین سے اٹھا۔ تو کسی نے اس سے کہا ——— "جاؤ۔ جا کر اپنے باپ سے شکایت کرو!"

یہ طنز اس کے دل میں چبھ کر رہ گیا۔ وہ سب اس سے زیادہ تگڑے تھے۔

اور وہ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا واقعی کوئی باپ نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کچھ دیر تو اس نے غرور کے مارے آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسوؤں کو پلکوں پر روکے رکھا۔ لیکن زیادہ دیر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے دشمنوں نے اس کے اِرد گرد ایک دوسرے کا ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر گھیرا سا بنا لیا۔ اور ایک ساتھ کورس میں سب گاتے ہوئے اس کے گرد چکر لگانے لگے ——— "اِس لونڈے کا کوئی باپ نہیں ہے۔ اس لڑکے کا کوئی پاپا نہیں ہے۔"

دفعتاً وہ چپ ہو گیا۔ وہ غصہ کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے پیر کے قریب ڈھیلے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے پتھر اٹھا اٹھا کر دشمنوں پر برسانے شروع کر دیئے۔ دو تین لڑکوں کے چوٹ آگئی۔ اور وہ روتے ہوئے گھروں کو بھاگ گئے باقی لڑکے اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور بزدلوں کی طرح میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ننھی سی جان بے باپ کا لڑکا اکیلا وہاں رہ گیا۔ پھر وہ میدان کی طرف دوڑنے لگا۔ اسے سخت روحانی تکلیف اور صدمہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ دریا میں ڈوب کر جان دیدے گا۔

اسے یاد آگیا کہ اسی دریا میں کچھ دن ہوئے ایک بھکاری نے غربت سے تنگ آکر ڈوب کر جان دے دی تھی۔ جس وقت اس کی لاش کو مچھلی کا جال ڈال کر نکالا گیا۔ تو سیمول وہاں موجود تھا۔ اس نے وہ ڈراونا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس بھکاری کے گال پچکے پڑ گئے تھے۔ اس کی ڈاڑھی سکڑ گئی تھی اور اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی دکھائی دے رہی تھیں۔

"مر گیا ہے بے چارہ!" کسی نے کہا تھا ——— اب اس کی روح کو سکون مل

گیا ہے"۔ اسی لئے سیموں بھی مر جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کا کوئی باپ نہیں تھا۔ بالکل اسی بھکاری کی طرح جس کے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا۔

وہ دریا کے پاس پہنچ گیا۔ دریا بہہ رہا تھا۔ اور مچھلیاں ادھر ادھر تیرتی پھر رہی تھیں۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اچک اچک کر کیڑوں کو پکڑ لیتی تھیں۔ اس نے رونا بند کر دیا۔ اور کیڑوں کے اس شکار دیکھنے میں محو ہو گیا۔ لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے رہ رہ کر وہی خیال ستانے لگا۔

"مجھے مر جانا چاہیئے۔ کیونکہ میرا کوئی باپ نہیں ہے"۔

موسم بڑا سہاونا تھا چمکتی ہوئی دھوپ گھاس کو گرمائے ہوئے تھی۔ پانی آئینہ کی طرح چمک رہا تھا۔ سیموں کو نیند آنے لگی۔ ایسی ہی جیسے خوب رونے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ اسکی طبیعت چاہتی تھی کہ وہ بھی گرم گرم گھاس پر پڑ کر سو رہے۔ اتنے میں اس کی ٹانگوں میں سے ہرے رنگ کا ایک مینڈک پھدک کر نکل گیا۔ اس نے اس کو پکڑنا چاہا۔ لیکن وہ اس کی انگلیوں کے بیچ میں سے پھسل کر نکل گیا۔ اسی طرح وہ تین مرتبہ پھسل پھسل کر نکل گیا۔ آخر کار چوتھی بار اس نے مینڈک کی پچھلی ٹانگیں پکڑ لیں۔ اور اس کی بھاگ نکلنے کی کوششوں کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ مینڈک اپنی دونوں پچھلی ٹانگوں کو جوڑ کر اسے باہر کی طرف پھیلا دیتا تھا۔ جیسے لوہے کی سلاخیں۔ اس کے گول گول دیدے سنہری مائل حلقوں کے بیچ بڑی تیزی سے نیچے اوپر گھوم رہے تھے۔ اور وہ آگے کی طرف نکلے ہوئے سینگوں کو اس طرح ہوا میں گھما رہا تھا جیسے ہاتھ ہل رہے ہوں۔ مینڈک کو دیکھتے دیکھتے اسے ایک لکڑی کا کھلونا یاد آ گیا۔ جس میں ایک سپاٹ لکڑی کے تختے پر کیل سے ٹھکے ہوئے ٹیڑھے میڑھے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے ٹکڑے ایک مسلسل حرکت سے اس کے ساتھ لگے ہوئے مٹی

کے سپاہیوں کو پریڈ کرایا کرتے تھے۔

پھر اسے اپنا گھر یاد آگیا اور گھر کی یاد کے ساتھ ماں کی یاد آگئی۔ اور وہ یکایک ساری باتیں یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اور دعائیں مانگنے لگا۔ ایسے جیسے کہ وہ سوتے وقت دعائیں مانگا کرتا تھا۔ لیکن روتے روتے اس کی گھگی بندھ گئی۔ اور وہ دعائیں پوری نہ کر سکا۔ وہ اتنا رویا۔ اتنا رویا کہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ اور آس پاس کے ماحول سے غافل ہو گیا۔

اتنے میں کسی نے بھاری بھاری ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ اور کرخت آواز میں کہا ——— "کیوں بیٹا! کیا بات ہے۔ اتنا پھوٹ پھوٹ کر کیوں رہے ہو؟"

سیموں نے گھوم کر دیکھا۔ کالی داڑھی اور گھونگھرالے بالوں والا گاؤں کا نوجوان لوہار بڑے پیار سے اس کو تک رہا تھا۔ اس نے روتے ہوئے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

"اسکول کے لڑکوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ میرا کوئی باپ نہیں ہے۔"

"کیوں؟" اس آدمی نے پوچھا ——— "بھلا بے باپ کا کون ہو سکتا ہے؟"

لڑکے نے بڑی دکھ بھری آواز میں کہا ——— "لیکن میرا تو باپ نہیں ہے۔"

یہ سن کر وہ آدمی سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے مس لابلانشوت کے لڑکے کو پہچان لیا تھا۔ گو یا کہ اس گاؤں میں ابھی وہ نو وارد تھا ——— لیکن اس نے اس عورت

کے متعلق اڑتی اڑتی خبریں سن رکھی تھیں۔

"روؤ مت میرے بچے! آؤ گھر چلیں۔ تمہاری ماں کے پاس۔ وہ بتلائے گی تم کو کہ تمہارا باپ کون ہے؟"

اس نے لڑکے کی انگلی پکڑ لی۔ اور وہ دونوں روانہ ہو گئے۔ وہ آدمی زیر لب یہ سوچ کر مسکرا رہا تھا کہ چلو اسی بہانے اس عورت سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہ دیہات کی خوبصورت ترین لڑکی کہی جاتی تھی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر وہ ایسی ہی ہے جیسی کہ مشہور ہے۔ تو ممکن ہے میرے بھی ہاتھ لگ جائے۔

آخر کار وہ دونوں ایک چھوٹے سے صاف ستھرے مکان کے سامنے پہنچے۔

"یہی ہے میرا گھر" اس لڑکے نے کہا۔ اور زور سے اپنی ماں کو آواز دی۔

ایک عورت دروازہ میں نمودار ہوئی۔ اس کو دیکھ کر اس آدمی کی ساری مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس عورت کی شکل سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ اب اسے کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ اپنے دروازے کے سامنے عزم و استقلال کی ایک تصویر بنی کھڑی تھی۔ اور اس کا چہرہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ "ایک مرد سے میں دھوکا کھا چکی ہوں۔ لیکن اب دنیا کا کوئی مرد مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔"

سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے اس نے رکتے رکتے کہا ——— "خاتون! تمہارا لڑکا دریا کے کنارے کھو گیا تھا۔ میں اسے ڈھونڈ کر تمہارے پاس لے آیا ہوں"۔

لیکن سیموں نے اپنی دونوں باہیں ماں کی گردن میں ڈالتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا۔ "نہیں ماں! میں دریا میں ڈوب کر جان دینے گیا تھا۔ اسکول کے لڑکوں نے آج مجھے بہت مارا ہے۔ کہتے ہیں کہ تیرا باپ نہیں ہے"۔

یہ سن کر اس دوشیزہ کے گال انگاروں کی طرح لال ہو گئے۔ اس نے بڑے زور سے اپنے بچے کو چھاتی سے چمٹا لیا۔ اور اس کے گالوں پر ٹپ ٹپ آنسوؤں کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ آدمی بھی اوندھا سا ہو گیا۔ اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ کیا کرے۔ اتنے میں سیموں اس کی طرف گھوم پڑا۔ اور کہا "تم میرے باپ کیوں نہیں بن جاتے"؟

ایک سکتہ سا چھا گیا۔ مس لا بلانشوت شرم کے مارے پانی پانی ہو گئی اور وہ دونوں ہاتھ چھاتی پر رکھ کر نظریں نیچی کئے ہوئے دیوار کی طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ بچے نے جب دیکھا کہ کوئی جواب نہیں دے رہا ہے۔ تو اس نے کہا "اگر تم میرے باپ نہیں بنو گے تو میں دریا میں ڈوب کر جان دے دونگا"!

آدمی نے جلدی سے جواب دیا۔ "ہاں۔ ہاں۔ میں تمہارا باپ بنونگا"!

"تمہارا نام کیا ہے"؟ لڑکے نے پوچھا "اگر اگر کوئی میرے باپ کا نام پوچھے گا تو میں تمہارا نام تبلا دونگا"!

"فلپ" اس نے جواب دیا۔

سیموں چپ ہو گیا۔ اور اس نام کو بار بار دل ہی دل میں دہرانے لگا۔ تاکہ کہیں وہ بھول نہ جائے۔ پھر اس نے بڑے پیار سے اپنی باہیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا فلپ۔ تو آج سے تم میرے باپ ہو"!

دوسرے دن جب وہ اسکول گیا۔ تو لڑکوں نے بڑی حقارت سے اسے گھورنا شروع کر دیا۔ اور جب چھٹی ہوئی۔ تو پھر لڑکوں نے اسے گھیر لیا۔ اور تنگ کرنے لگے۔ اس کے باپ کا نام پوچھنے لگے۔ سیموں نے گھوم کر ان کے منہ پر جملہ پھینکا جیسے وہ ڈھیلا پھینک رہا ہو۔ "میرے باپ کا نام فلپ ہے"۔

یہ سن کر وہ شور مچانے لگا۔ ایک نے کہا "فلپ - کون فلپ" ؟
دوسرے نے کہا "یہ فلپ کون ہے سالا" ؟
تیسرے نے کہا۔ "اس کو کب سے باپ بنالیا" ؟

سیموں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور وہیں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح گھورتا رہا۔ جیسے وہ کبھی ہار ماننے والا نہیں ہے۔ چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اتفاقاً ماسٹر وہاں پہنچ گیا اور اس نے سیموں کی جان بچائی۔

متواتر تین ماہ تک فلپ اس عورت کے گھر کے سامنے سے برابر گذرا کرتا تھا اور جب وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی سیتی پروتی رہتی تھی تو ہمت کر کے کبھی کبھی اسے مخاطب بھی کر لیتا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دے دیتی تھی۔ اس نے نہ تو کبھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور نہ کبھی گھر کے اندر آنے کی دعوت دی۔ پھر بھی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ باتیں کرنے میں زیر لب مسکرا رہی ہو۔

سیموں تو اسے بہت پیار کرتا تھا۔ اور روزانہ شام کو اپنے نئے باپ کے ساتھ انگلی پکڑے ہوئے چہل قدمی کرنے جایا کرتا تھا۔ وہ اسکول میں اب لڑکوں سے گھل مل گیا تھا اور ان کی چھیڑ خانیوں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔

ایک دن اس لڑکے نے جس نے پہلے دن اسے چھیڑا تھا۔ اس سے کہا "تم جھوٹ بولتے ہو۔ فلپ تمہارا باپ نہیں ہے"۔

"کیوں ؟" سیموں نے بگڑتے ہوئے پوچھا۔

لڑکے نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "اگر فلپ تمہارا باپ ہوتا تو تمہاری ماں کا شوہر بھی ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ایک گھر میں رہتا سہتا"۔

سیموں اس منطق کی سچائی سے پس و پیش میں پڑ گیا۔ پھر بھی اس نے کہا ــــــ "لیکن وہ میرا باپ تو ہے"۔ لڑکے نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا ــــــ "اوہوں! وہ تمہارا اصلی باپ نہیں ہے"۔

مس لابلانشوت کا لڑکا گردن جھکائے ہوئے کچھ سوچتا ہوا کارخانے کی طرف چلنے لگا۔ جہاں فلپ کام کرتا تھا۔

یہ لوہے کا کارخانہ ہر طرف سے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس جگہ کافی اندھیرا سا تھا۔ بھٹی کی آگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور پانچ لوہار ایک سرخ لوہے کی سلاخ پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ ان کی آنکھیں لال لال سلاخ پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ پیٹتے جا رہے تھے۔ اور ہتھوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلاخ کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات بھی چوٹ کھا رہے ہوں۔

سیموں خاموشی سے وہاں داخل ہو گیا اور فلپ کے قریب جا کر آہستہ سے اس کی آستین پکڑ لی۔ فلپ نے گھوم کر دیکھا۔ سارے مزدوروں نے ہتھوڑے رکھ دیے اور حیرت سے لڑکے کو دیکھنے لگے۔ اس خاموشی کو چیرتے ہوئے ننھی سی آواز میں سیموں نے کہا ــــــ "فلپ پاپا! اسکول کے لڑکے کہتے ہیں کہ تم میرے اصلی باپ نہیں ہو"۔

"کیسے؟" فلپ نے پوچھا۔

"کیونکہ تم میری ماں کے شوہر نہیں ہو اور اس کے ساتھ نہیں رہتے ہو"۔ بچے نے بڑی معصوم آواز میں کہا۔

وہ سب چپ تھے۔ فلپ ہتھوڑے کے دستے پر اپنے مضبوط ہاتھوں کے اوپر ٹھوڑی لگائے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے چاروں ساتھی اس کی طرف گھور رہے تھے اور سیموں ان پانچوں دیو ہیکل انسانوں کے بیچ کھڑا ہوا جواب کا

منتظر تھا۔ یکایک ایک لوہار نے اسے کہا۔ جیسے وہ سب کی طرف سے کہہ رہا ہو ——
بہرحال لابلا لشوت شریف اور نیک عورت ہے۔ گو وہ ایک بار دھوکا کھاکر بدنام ہو چکی ہے۔ پھر بھی وہ ایک اچھی بیوی بن سکتی ہے"۔

"ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ دوسروں نے اس کی ہاں کی ہاں میں ملاتے ہوئے کہا۔

لوہار نے اپنی گفتگو جاری کرتے ہوئے کہا —— "اس بے چاری کا کوئی قصور نہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اسے شادی کا لالچ دے کر دھوکا دیا گیا۔ میں ان عورتوں کو بھی خوب جانتا ہوں۔ جو پرلے درجے کی آوارہ ہوتے ہوئے بھی بڑی پارسا بنی پھرتی ہیں۔

"ہاں۔ ہاں"۔ تینوں نے پھر اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بے چاری محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پال رہی ہے اور بچے کو تعلیم دے رہی ہے۔ کتنی دکھی ہے وہ۔ نہ تو کسی سے بات چیت کرتی ہے اور نہ کبھی گھر سے باہر قدم نکالتی ہے۔ صرف گرجا گھر جانے کے لئے باہر آتی ہے"۔

"ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے"۔ تینوں نے پھر اس کی تائید کی۔

اس کے بعد پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ صرف بھٹہ چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

فلپ نے سیموں سے کہا —— "اچھا بیٹا! اب تم جاؤ اور اپنی ماں سے کہنا کہ شام کو میں اس سے ملنے آؤں گا"۔

اس نے لڑکے کو باہر کر دیا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ پھر پانچوں ہتھوڑے لوہے کی سلاخ پر برسنے لگے۔ شام تک وہ لوہے کو پیٹتے رہے۔ فلپ پوری طاقت سے بھرپور ہاتھ مارتا تھا۔ اور اس کے ہتھوڑے کی ضرب کی آواز دوسرے سے زیادہ سنائی دیتی تھی۔ اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا ہتھوڑا پوری طاقت سے لوہے کی سلاخ پر برس رہا تھا۔

جس وقت اس نے مس لابلانشوت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو تارے نکل چکے تھے۔ وُہ سفید قمیض پہنے ہوئے تھا اور اس کی ڈاڑھی بھی قرینے سے جمی ہوئی تھی۔ جوان عورت دروازے پر آگئی۔ اور اس نے آہستہ سے کہا ——— "اتنی رات گئے تمہیں میرے پاس نہیں آنا چاہیئے۔ مسٹر فلپ! لوگ کیا کہیں گے"؟

اس نے جواب دینا چاہا۔ لیکن اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

اس نے پھر کہا ——— اور تم جانتے ہو کہ مَیں وَیسے ہی گاؤں میں بدنام ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اور بدنام ہو جاؤں اور کہیں کی نہ رہوں"؟

اس نے فوراً جواب دیا ——— "مجھے کسی کے کہنے کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"!

یکایک خاموشی چھا گئی۔ اور کسی کے لڑکھڑانے کی آواز آئی۔ وہ جھٹ سے اندر داخل ہو گیا اور اندھیرے میں لڑھکتی ہوئی عورت کو اپنے دونوں بازوؤں میں تھام لیا۔ سیموں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اُسے ایسا سنائی دیا جیسے اس کی ماں دھیرے دھیرے کسی سے سرگوشیاں کر رہی ہو۔ پھر اس نے ایسی آوازیں سنیں۔ جیسے کوئی اندھیرے میں بڑی دور زور سے گھوڑوں کو پچکار رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد اس کے پاپا فلپ نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کو بستر سے اٹھا لیا۔ اور کہا "تم سکول کے سارے لڑکوں سے کہہ دینا کہ میرا باپ فلپ ایمی لوہار ہے۔ اور اگر زیادہ تنگ کرو گے تو میرا باپ ان سب کے کان اینٹھے گا"!

دوسرے دن جب سارے لڑکے کلاس میں جمع تھے۔ تو سیموں نے کھڑے ہو کر اعلان کیا:-

"میرا باپ فلپ ایمی لوہار ہے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے مجھے تنگ کیا تو میرا باپ

تم سب لوگوں کا کان اکھاڑ دے گا۔"

یہ سن کر تمام لڑکوں کے لبوں سے ہنسی غائب ہوگئی۔ وہ سب فلپ ایمی لوہار کو جانتے تھے۔ وہ ایسا باپ تھا۔ جس کا بیٹا ہونے پر ہر لڑکا فخر کر سکتا تھا۔

"Love Secret"

رازِ عشق

قبرستان فوجی افسروں سے بھرا ہوا تھا۔ زرق برق وردیوں میں ملبوس وہ اِدھر سے اُدھر ایسے گھوم رہے تھے جیسے زمین پر پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہوں۔ ہری پیلی ٹوپیاں۔ رنگین پٹی دار پتلونیں۔ کاندھوں پر چمکتے ہوئے سنہری رنگ کے بٹن لگائے ہوئے وہ سب مزاروں کے بیچ کی تنگ روشوں پر ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ مزاروں پر کی صلیبیں جو کچھ تو سنگ مرمر کی تھیں۔ کچھ لکڑی کی اور کچھ لوہے کی۔ نسل انسانی کی گذشتہ یادگاروں پر بازو پھیلائے ہوئے کھڑی تھیں۔

کرنل ہبوزان کی بیوی کو ابھی ابھی سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ دو دن پیشتر وہ دریا میں نہاتے ہوئے ڈوب کر مرگئی تھی۔ قبر کھد چکنے کے بعد سب لوگ ایک ایک کر کے واپس جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ پادری بھی چلا گیا۔ لیکن کرنل ابھی تک اپنے دو ساتھی افسروں کے درمیان ان کا سہارا لئے ہوئے قبر کے سامنے ایسے ٹکٹکی لگائے کھڑا تھا جیسے اس لکڑی کے تابوت میں بند اس کی نوجوان بیوی کی مسخ شدہ لاش ابھی تک اس کی نظر کے سامنے ہو۔

وہ چھریرے جسم کا لمبے قد کا آدمی تھا۔ اس کی مونچھیں بالکل سفید ہو چکی تھیں۔ اور تقریباً بوڑھا ہو چکا تھا۔ تین سال پیشتر اس نے اپنے دوست کرنل سارنس کی یتیم اور لاوارث لڑکی سے اس بوڑھاپے میں شادی رچائی تھی۔

کپتان اور لفٹننٹ نے جن کا سہارا لئے ہوئے وہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کو واپس لے چلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے کہا ــــ "نہیں۔ ابھی نہیں۔ کچھ دیر تو اور ٹھہر لینے دو"۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بالکل ڈبڈبا آئی تھیں۔ لیکن وہ اپنی بہادری کی لاج کے مارے آنسوؤں کو پلکوں میں پروئے ہوئے تھا۔ اس کی ٹانگیں جھکی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ قبر کے سامنے سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اور بڑی غور سے اس خلاء کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس میں اس کی محبت، اس کی زندگی کی سب سے عزیز ترین شئے نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

اتنے میں جنرل آرمول وہاں آگیا۔ اور اس نے زبردستی کرنل کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا ــــ "واپس چلو میرے دوست! اب یہاں ٹھہرنے سے کیا فائدہ؟"

کرنل نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اسے میز پر ایک خط پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے اس خط کو اٹھا لیا۔ اور اپنی بیوی کی تحریر پہچان کر حیرت اور تعجب سے گرتے گرتے بچا۔ اس لفافے پر اسی دن کی ڈاک خانہ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس نے خط کو پڑھنا شروع کیا۔

میرے پیارے پاپا!

"میں آپ کو بچپن میں بھی پاپا کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ چنانچہ آج بھی اسی نام سے مخاطب کر رہی ہوں۔ جس وقت یہ خط آپ کو ملے گا۔ اس وقت میں مر چکی ہونگی۔ اور منوں مٹی کے نیچے دفن ہو چکی ہونگی۔ اس لئے شاید آپ مجھے معاف کر دیں۔

"میں نہ آپ سے ہمدردی کی متمنی ہوں اور نہ اپنے گناہوں کو آپ کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہوں۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر میں اپنی زندگی کا گلا خود اپنے ہاتھوں گھونٹنے والی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ مرنے سے پہلے ایمانداری کے ساتھ اپنی خودکشی کی وجہ آپ کے گوش گذار کردوں۔

"جس وقت آپ نے مجھے ممنون کرنے کے لئے مجھ لاوارث اور یتیم سے شادی کی۔ تو میں نے آپ کو اپنا محسن اعظم سمجھتے ہوئے اپنی ہستی کو آپ کے سپرد کردیا۔ میں بالکل معصوم بچوں کی طرح آپ سے محبت کرنے لگی بالکل اسی طرح جس طرح میں اپنے مرحوم باپ کو پیار کرتی تھی۔ ایک دن جب میں آپ کی آغوش میں لیٹی ہوئی تھی اور آپ میرے لبوں پر بوسوں کی بارش کر رہے تھے تو میں نے بے تحاشا آپ کو "پاپا" کہہ کر پکارا۔ یقین جانیئے کہ آواز میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔ میں آپ کو حقیقتاً باپ سمجھ کر پیار کرتی تھی۔ آپ بھی یہ سن کر ہنس پڑے تھے۔ اور آپ نے کہا تھا ——— "میری بچی ..... مجھے اسی نام سے پکارا کرو۔ میں اس سے بہت خوش ہوتا ہوں"۔

"...... پھر ہم لوگ شہر چلے آئے اور پاپا ..... آپ خفا نہ ہوں تو میں کہوں کہ میں شہر آکر کسی کے دام محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اُف! میں نے مسلسل دو سال تک صبر و تحمل سے کام لیا۔ لیکن میں اپنے آپ پر زیادہ جبر نہ کرسکی اور انتہائی کوشش کے باوجود غار ذلت میں گر پڑی۔ اور میرا دامن عصمت تار تار ہو گیا۔

"وہ کون تھا؟ یہ آپ کبھی نہ جان سکیں گے۔ کیونکہ میرے گرد کم سے کم ایک درجن فوجی افسر۔ چوبیس گھنٹے منڈلاتے رہتے تھے۔ جن کے متعلق اکثر آپ کہا کرتے تھے ——— "یہ سب تمہارے باڈی گارڈ ہیں"۔

"پاپا! آپ کو میرے سر کی قسم اس نوجوان کا کھوج لگانے کی کوشش ہرگز ہرگز

نہ کہے گا - اور نہ اس کو نظر حقارت سے دیکھے گا - کیونکہ اس نے وہی کیا جو ایک نوجوان مرد ایسے حالات میں کر سکتا ہے - مجھے یقین کامل ہے کہ وہ مجھے دل سے پیار کرتا تھا۔

"ایک روز جب حسب معمول ہم دونوں بے کیس کے جزیرے پر چوری چوری ملاقات کرنے والے تھے - آپ جانتے ہیں کہ یہ جزیرہ فیکٹری کے قریب ہے - میں تیر کر جزیرے پر پہنچی - اور وہ پہلے ہی سے وہاں جھاڑیوں میں موجود تھا اور شام تک وہ وہیں چھپا رہتا تھا - تاکہ کوئی ہم دونوں کو ساتھ آتا جاتا نہ دیکھ لے - ہم دونوں ابھی آغوش محبت میں مدہوش تھے کہ ایک طرف جھاڑی کے پیچھے سے ایک شخص نمودار ہوا - اس شخص کو دیکھ کر میں تو بالکل گھبرا گئی - اور بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل گئی - یہ نو وارد آپ کا اردلی تھا - یہ منظر دیکھ کر میرے عاشق نے مجھ سے کہا ———

"ڈارلنگ! تم فوراً تیر کر واپس چلی جاؤ - میں سب ٹھیک کر لونگا۔"

"میں اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ ڈوبتے ڈوبتے بچی - اور نہایت ہی پریشان حال گھر واپس پہنچی - مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی خطرناک حادثہ پیش آنے والا ہو -

"ایک گھنٹہ بعد ڈرائنگ روم کے باہر گیلری میں فلپ مجھ سے ملا - اور اس نے دبے دبے الفاظ میں مجھ سے کہا ——— "میڈم! آپ بالکل پریشان نہ ہوں - میں آپ کا خادم ہوں - اگر کوئی خط یا پیغام بھیجنا ہو تو مجھ سے فرمائیے!"

"میں سب سمجھ گئی - وہ روپیہ کے لالچ میں بک چکا تھا - اور میرے عاشق نے اس کو خرید لیا تھا - میں نے اسے خطوط دینے شروع کر دیئے اور وہ ہم دونوں کے درمیان نامہ بری کا کام انجام دینے لگا - دو ماہ تک یہ قصہ چلتا رہا - ہم دونوں کو اس پر کافی بھروسہ ہو گیا تھا - بالکل اسی طرح جس طرح آپ کو اس پر اعتماد تھا۔

"پاپا! حسب معمول ایک دن میں اسی جزیرہ پر تیر کر اپنے عاشق سے ملاقات

کرنے کے لئے پہنچی ۔ تو دیکھا کہ وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا ۔ اور اس کی جگہ آپ کا اردلی میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ وہاں بڑی دیر سے میرا منتظر تھا ۔ اس نے مجھ سے صاف صاف الفاظ میں کہا کہ اگر میں اسے اپنے آپ سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ نہ دونگی تو وہ بھانڈا پھوڑ دیگا ۔ اور سارا واقعہ آپ کے گوش گذار کر دیگا ۔ اور میرے خطوط بھی آپ کو دکھا دیگا۔

"اُف! ـــــ پاپا! یہ سُن کر میرے پیر کے نیچے سے زمین نکل گئی ۔ مجھے ڈر اور خوف محسوس ہونے لگا ۔ ایک ایسا خوف جو مجھے بدنام کر دے گا اور منہ دکھانے کے قابل نہ رکھے گا ۔ سب سے زیادہ آپ کو معلوم ہو جانے کا ڈر ۔ اس لئے کہ آپ مجھ سے اتنی محبت سے پیش آتے تھے اور میں نے آپ کو دھوکا دیا تھا ۔ مجھے ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں واقعات معلوم ہو جانے پر مجھے آپ گولی سے نہ اڑا دیں ۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو شاید میں بھی یہی کرتی ۔ میں بیان نہ کر سکتی ۔ کہ اس وقت میری کیا حالت تھی ۔ میں بالکل پاگل ہو رہی تھی ۔ آخر کار جب میری سمجھ بالکل جواب دے چکی ۔ تو میں اس بدمعاش کا منہ بند کرنے کے لئے اس ذلیل گناہ پر تیار ہو گئی ـــــ اُف! کتنی شرمناک بات تھی ۔

"ہم عورتیں بھی کتنی کمزور ہوتی ہیں ۔ وقت پڑنے پر مردوں کی طرح ثابت قدم نہیں رہ سکتیں ۔ عورت اگر ایک بار شرم و حیا کھو بیٹھتی ہے ۔ تو کھوتی ہی چلی جاتی ہے میں کچھ نہ جانتی تھی ۔ کہ آخر میں کیا کر رہی ہوں ۔ چپ چاپ میں نے اپنے آپ کو اس کمینے کے حوالے کر دیا ۔

"پاپا! ـــــ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتی ۔ آخر کو جس بات کا ڈر تھا ۔ وہی ہوا ۔ جب بھی اس بدمعاش کی طبیعت چاہتی ۔ وہ مجھے دھمکیاں دینے لگتا اور میں اس کی خواہش کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتی ۔ وہ تقریباً روزانہ عاشقوں کی طرح اپنی محبت کے مظاہرے کرنے لگا ۔ اُف! کس قدر شرمناک بات تھی ۔ کیا سزا ہو سکتی ہے ۔

اس گناہ کی؟

"میری عزّت داغ دار ہو چکی ہے۔ اور میں دُنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئی ہوں۔ میں اس گناہ کا اعتراف آپ کے سامنے بھی نہ کر سکتی تھی۔ سوائے موت کے میرے لئے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ میرے لئے ڈوب کر مر جانا ہی بہتر ہے۔ آپ زمزم سے دُھلنے کے بعد بھی میرے گناہوں کی آلودگی نہیں جا سکتی ہے۔ میں نہ اب کسی سے محبت کر سکتی ہوں اور نہ خود کسی کی محبّت کے لائق رہ گئی ہوں۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا ہے کہ میرا سایہ شاید فرشتوں کو بھی ناپاک کر دے۔

"میں اب دریا میں نہانے جا رہی ہوں۔ اور کبھی واپس نہ لوٹوں گی۔ میں اس خط کو اپنے عاشق کے پاس بھیج رہی ہوں۔ میری وصیت کے مطابق یہ خط آپ کو اس وقت پہنچایا جائیگا۔ جب کہ میں مر چکی ہوں گی۔ آپ کو یہ خط قبرستان سے واپسی کے بعد ملے گا۔

"خدا حافظ پاپا ——— ! میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتی ہوں۔ بس میری آخری خواہش یہی ہے کہ آپ میرے گناہوں کو معاف کر دیجیے"۔

کرنل نے پیشانی سے پسینے کی بوندیں پونچھیں۔ اس نے ایسا اطمینان اور سکون محسوس کیا جیسا کہ وہ میدان جنگ میں محسوس کیا کرتا تھا۔ اس نے گھنٹی بجائی۔

نوکر داخل ہوا۔ "فلپ کو میرے پاس بھیج دو"۔ کرنل نے نوکر سے کہا۔ اس کے بعد اس نے میز کی دراز سے پستول نکال لیا۔

ارد لی فوراً ہی کمرے میں داخل ہوا۔ اور سلوٹ مار کر اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ وہ ہٹے کٹے جسم کا جوان تھا۔ اس کی مونچھیں بھورے رنگ کی تھیں اور آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔

کرنل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں تم سے یہ پُوچھنا چاہتا ہوں کہ میری بیوی کا عاشق کون تھا؟"

"لیکن ــــــ کرنل"

کرنل نے پستول کی نالی اس کے سینے پر تان لی۔

جو میں پُوچھ رہا ہوں۔ اس کا جواب دو۔ تم جانتے ہو کہ میں حکم عدولی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہُوں"۔

اچھا ــــــ بتلاتا ہوں کرنل ــــــ وہ البرٹ......"

ابھی پُورا نام بھی اس کی زبان سے نکلنے نہ پایا تھا۔ کہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دھواں اُٹھتا دکھائی پڑا۔ دھڑام سے وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ پستول کی گولی اس کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی تھی۔

Hon'ble Govt names Broman

سرکار بہادر بنام برومان وغیرہ

ملزم نمبر ۱ مسمی برومان اور ملزم نمبر ۲ مسمی کارنو اس وقت ضلع الغربری کی عدالت فوجداری میں حاضر اجلاس تھے۔ ان دونوں پر فرد جرم یہ عاید کی گئی تھی کہ انہوں نے مادام برومان زوجہ ملزم نمبر ۱ مقدمہ ہذا کو بہ نیت قتل پانی میں ڈبو کر جان سے مار ڈالنے کا جرم کیا تھا۔ کمرہ عدالت میں وہ دونوں ایک دوسرے کی بغل میں ملزمان کی مخصوص نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان ملزمان کا پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ ملزم نمبر ۱ ضلع کیری کو تو کا رہنے والا تھا۔ اور سوروں کی افزائش نسل کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کا قد چھوٹا اور جسم گٹھیلا اور مضبوط تھا۔ بازو اور ٹانگیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ سر کدو کی طرح بالکل گول تھا۔ چہرہ دانوں سے بھرا ہوا بیضوی شکل کا تھا اور کاندھوں سے اس قدر لگا ہوا تھا کہ گردن کی موجودگی کا کہیں پتہ نہ چلتا تھا۔

ملزم نمبر ۲ مسمی کارنو درمیانے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ لیکن اس کے بازو معمول سے زیادہ لمبے تھے۔ اس کا سر پچکا ہوا تھا۔ جبڑا ٹیڑھا تھا۔ اور ڈھینڈ ہے تاکتا تھا۔ اس نے

جسم پر نیلے رنگ کا ایک قمیض نما کرتہ گھٹنوں تک لمبا پہن رکھا تھا۔ پیلی پائل رنگت کے کھُردرے کھُردرے بال اس کے سر پر چوپڑے ہوئے سے معلوم پڑتے تھے اور اس حلیہ میں وہ نہایت ہی غلیظ اور کریہہ المنظر دکھائی دے رہا تھا۔ لوگ اس کو مذاقاً "پادریا" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ گرجا گھر کے پادریوں کی ہو بہو نقل اتارا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ منہ سے بھنبھی سانپ کی آواز نکالتا تھا۔ کیری کو تو میں اس کا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اور اس کی ان مذاحیہ خصوصیات کی وجہ سے اس کے کیفے میں ایسے لوگوں کی کافی بھیڑ ہو جاتی تھی۔ جنہیں "پادریا" کا وعظ گرجا گھر کے پادریوں کے وعظ سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔

میڈم بروماں زوجہ ملزم نمبرا جو کہ اس مقدمہ میں مستغیثہ تھی گواہوں والی بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک دیہاتی کسان عورت تھی اور چہرہ سے بالکل اونگھنی صورت دکھائی پڑتی تھی۔ دونوں ہاتھوں کو اوپر نیچے گھٹنوں پر دھرے ہوئے وہ بالکل گپ چپ بُت کی طرح سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے تک رہی تھی۔

جج صاحب نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو مادام بروماں! ——— یہ دونوں ملزمان تمہارے کمرے میں داخل ہوئے اور تم کو اٹھا کر پانی کے پیپے میں پھینک دیا؟ پھر کیا ہوا؟ کھڑی ہو جاؤ۔ اور جملہ واقعات بیان کرو!

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا قد تاڑ کی طرح لمبا تھا اور اس کی ٹوپی کی شکل سفید گنجی کھوپڑی کی طرح تھی۔ الفاظ کو چبا چبا کر اس نے اس طرح بیان دینا شروع کیا:-

"میں دانہ پھٹکار رہی تھی کہ اتنے میں یہ دونوں اندر آگئے۔ ان لوگوں کی حالت

دیکھ کر میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ نہ جانے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کی حرکتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہیں۔ اور کچھ شرارت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اتنے میں وہ میرے قریب آ گئے۔ اور میرے چاروں طرف گھوم گھوم کر مجھے گھورنے لگے۔ خاص کر کارنو تو ایسے "گھور رہا تھا۔ کیونکہ وہ ڈھینڈ سے تاکتا ہے۔ اور دونوں کے ملنے جلنے کو میں ہمیشہ ناپسند کرتی تھی۔ کیونکہ جب بھی یہ دونوں ایک ساتھ ہوتے ہیں تو کچھ نہ کچھ شیطانی کرتے ہیں۔ آخر کار میں نے پوچھا ــــــ "تم لوگ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہو"؟ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور میرے دل میں اسی وقت کچھ کھٹکا سا پیدا ہونے لگا"۔

بروماں ملزم نے مستغیثہ کے بیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"حضور والا! ــــــ میں نشہ میں تھا"۔

یہ سن کر کارنو نے اپنے ساتھی ملزم کی طرف پلٹ کر تفسیری جیسی آواز میں کہا۔

"یہ کہو کہ ہم دونوں نشہ میں تھے۔ سچی بات کبھی چھپانی نہیں چاہیئے"؟

جج صاحب نے کہا ــــــ "تمہارا مطلب ہے کہ تم دونوں پیئے ہوئے تھے"۔

کارنو۔ "جی سرکار ــــــ! اور کون ایسا ہے جو پیتا نہیں ہے"۔

جج صاحب نے مستغیثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ــــــ "بیان جاری رکھو مادام بروماں!"

اس کے بعد بروماں نے مجھ سے پوچھا۔ "ہم لوگ تمہیں سوسوس (SOUS) دینا چاہتے ہیں۔ لوگی ــــــ؟ میں نے جواب دیا ــــــ "ہاں"۔ یہ سوچتے ہوئے کہ سوسوس (SOUS) جیسی رقم کہیں سڑک پر پڑی ہوئی تھوڑی ہی مل جاتی ہے۔

پھر اس نے کہا ——— "اچھا۔ تو دھیان سے سنو! اور جیسا میں کہتا جاؤں ویسے ہی کرتی جاؤ۔" باہر کی طرف پانی کے چھجے کے نیچے کونے میں ایک بڑا سا پیپا رکھا ہوا تھا۔ اُسے وہ لڑکھڑاتا ہوا باورچی خانے میں لے آیا اور سیدھا کر کے فرش پر رکھ دیا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔ "جاؤ۔ پانی لا لا کر اس پیپے کو لبالب بھر دو!"

"میں تالاب پر چلی گئی۔ اور دو بالٹیوں میں پانی لا لا کر گھنٹہ بھر تک اس میں بھرتی رہی۔ وہ شراب کا پیپا بڑا پیٹو تھا ——— سرکار معاف کریں!

اس دوران میں بروماں اور کارنو شراب کے گلاس اتارے چلے جا رہے تھے۔ جب وہ کافی پی چکے۔ تو میں نے کہا ——— "تم لوگوں کا پیٹ شراب سے اتنا بھر گیا ہے۔ جتنا یہ پیپا پانی سے"۔ بروماں نے یہ سن کر جواب دیا ——— "فکر نہ کرو۔ میری جان! ——— تم اپنا کام کئے جاؤ۔ کام ختم ہونے پر تمہاری بھی باری آئیگی۔ اور اپنا حصہ پاؤ گی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس پر بری طرح نشہ سوار تھا۔

جب پیپا لبالب بھر گیا۔ تو میں نے کہا ——— "لو۔ بھر گیا۔"

تب کارنو نے مجھے سو سو س دئے ——— بروماں نے نہیں بلکہ کارنو نے۔ کارنو نے مجھے یہ رقم دی۔ اس کے بعد بروماں نے کہا۔ کیا تم مزید سو سو س کمانا چاہتی ہو؟ میں نے جواب دیا۔ ہاں! اس لئے کہ پہلے کبھی بھی مجھے اس طرح مفت کی رقم نہیں ملی تھی۔ اس نے کہا۔

"اچھا ——— تو اپنے سارے کپڑے اتار دو۔ اور ننگی ہو جاؤ۔"

"کیا ——— ؟ کپڑے اتار دو؟

"ہاں"۔ اس نے کہا۔

"میں نے پوچھا۔ کون کون سے کپڑے اتار دوں؟

"اگر تمہیں زیادہ شرم محسوس ہو رہی ہو تو صرف چولی رہنے دو۔ باقی سب اتار دو۔ بس اس سے ہمارا مقصد حل ہو جائے گا۔

سو عدد سوس کا لالچ برا ہوتا ہے۔ اور اسی لالچ میں آکر میں نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دونوں اس وقت بالکل نشہ میں چور ہیں۔ اور کوئی حرکت نہ کر پائیں گے۔ میں نے پہلے اپنی ٹوپی اتاری پھر جاکٹ اتار دی۔ پھر لہنگا کھول کر نیچے کھسکا دیا۔ اور سب سے آخر میں جوتے اتار دئے۔ میں موزے اتارنے کے لئے جھک رہی تھی۔ کہ بروماں نے مجھے منع کرتے ہوئے کہا ——— "نہیں نہیں موزے مت اتارو۔ موزے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم لوگ شریف اور حیادار آدمی ہیں"۔

اس پر کارنو نے کہا۔ "ہاں ——— ہم لوگ ننگے تھوڑے ہی ہیں۔ سولہ آنے شریف ہیں"۔

" ——— اور اب میں ان لوگوں کے سامنے بالکل اماں حوا کی طرح سر سے پیر تک مادر زاد برہنہ کھڑی تھی۔ نشہ میں جھومتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے وہ دونوں کرسیوں پر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے قریب آگئے۔

بروماں نے پوچھا ——— کیوں بھائی! تیار ہو؟

کارنو نے جواب دیا ——— "ہاں ——— میں بالکل تیار ہوں"۔

" ——— اور پھر ایک نے میری ٹانگ پکڑی اور دوسرے نے ہاتھ اور مجھے اس طرح زمین سے اٹھا کر ہوا میں بیچ ادھر کر دیا۔ جیسے بھیگی ہوئی چادر سکھانے کے لئے ہوا میں تانی جاتی ہو۔ اور میں نے گھبرا کر چلانا شروع کر دیا۔

"بردماں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا ——— چپ رہ ——— شور مت مچا۔ پگلی کہیں کی!"

"پھر دونوں نے مجھے ہوا میں اچھالا اور پانی سے بھرے ہوئے پیپے میں پھینک دیا۔ میری سانس نیچے اوپر ہونے لگی اور سارا جسم سردی کے مارے ٹھٹھرنے لگا۔

بردماں نے کہا ——— کیوں ٹھیک ہے؟

کارنو نے جواب دیا ——— بس بالکل ٹھیک ہے!

اس پر بردماں نے پھر کہا ——— لیکن اس کا سر تو باہر رہی ہے۔ اس سے کہیں ناپ میں فرق نہ پڑ جائے؟

تو سر بھی ڈبو دو ——— کارنو نے جواب دیا۔

اس پر بردماں نے میرا سر اوپر سے دبا کر پوری طاقت سے اس طرح پانی میں ڈبو دیا۔ جیسے وہ مجھے ڈبو کر مار ڈالنا چاہتا ہو۔ میرے ناک کان اور حلق میں پانی گھس گیا اور مجھے تارے دکھائی دینے لگے۔ ایک بار پھر اس نے میرے سر کو ڈبکی دی اور میں سطح آب سے بالکل روپوش ہوگئی۔ یہ دیکھ کر غالباً وہ گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے مجھے اوپر کھینچ کر نکال لیا اور گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ جا کر بدن پونچھ ڈال!

میں اسی برہنگی کے عالم میں سر پہ پیر رکھ کر بھاگی۔ اور مانیشر لا کارد کے گھر جا کر دم لیا۔ مجھے سر سے پیر تک ننگ دھڑنگ دیکھ کر اس بے چارے نے جلدی سے اپنے نوکر کا غلاطہ میرے تن پر ڈھک دیا۔ اس کے بعد اس نے شی کو گھڑی ساز کو پولیس کو خبر کرنے کے لئے کری کو تو بھیجا۔ پولیس کے آنے پر ہم سب مل کر ہمارے گھر پہنچے ہم سب جب وہاں پہنچے۔ تو دیکھا کہ بردماں اور کارنو آپس میں کتوں کی طرح لڑ رہے تھے۔

بردماں چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ تم جھوٹ کہتے ہو ——— میں کہتا ہوں کہ اس میں

کم سے کم ایک کیوبک فٹ کا فرق ہے ۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے ۔

کورنو بھی زور زور سے کہہ رہا تھا ۔ چار پالش کا مطلب ہے آدھا کیوبک میٹر ۔ چپ رہو ۔ بک بک بند کرو ۔

" اس کے بعد پولیس افسر نے ان دونوں کو حراست میں لے لیا ——— حضور والا ! مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے "

اتنا کہہ کر وہ بیٹھ گئی ۔

عدالت میں سارے لوگ اس بیان کو سن کر ہنس پڑے ۔ لائق ممبران جیوری بھی ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے ۔ جج نے کہا ۔

" ملزم کارنو ——— ! اس جرم کے پلاٹ کے اصلی بانی مبانی تم ہی معلوم ہوتے ہو ۔ اپنی صفائی میں تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟"

کورنو کھڑا ہو گیا ——— " حضور والا ! اس نے کہا ——— میں اس وقت نشہ کی حالت میں تھا "

جج صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ۔

" یہ تو میں جانتا ہوں ۔ اس کے علاوہ اور کیا صفائی پیش کرنا چاہتے ہو ؟"

" جو حکم حضور والا ! ——— واقعہ یہ ہے کہ اس دن تقریباً نو بجے برومال میرے کیفے میں آیا ۔ اس نے دو پیگ شراب کا آرڈر دیا ۔ اور ایک گلاس میری طرف کھسکا دیا ۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے اور مزے سے پینے لگے ۔ پھر اخلاقاً میں نے اپنی طرف سے اس کو ایک گلاس پیش کیا ۔ اس کے بعد خاطراً اس نے مجھے ایک گلاس اور پلا دیا ۔ میں نے بھی جواباً ایک گلاس اور پیش کیا ۔ جو حال اسی طرح پیتے پلاتے دوپہر تک دور شراب چلتا رہا ۔ اور ہم دونوں نشے میں مست ہو گئے ۔

"اتنے میں یکایک بروماں زار و قطار رونے لگا۔ مجھے اس کی آہ وزاری پر ترس آگیا۔ اور میں نے اس کے رونے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے جواب دیا

"میرے بھائی! جمعرات تک مجھے ایک ہزار فرانک کی سخت ضرورت ہے"۔ یہ سن کر میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ اگر روپے کا انتظام نہ ہوسکا۔ تو میں اپنی بیوی کو فروخت کردونگا۔ کیا تم خریدو گے؟

"ایک تو میں رنڈوا ہوں۔ دوسرے میں اس وقت نشے میں تھا حضور والا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ سن کر اس وقت میری کیا حالت ہوتی ہوگی! پہلے کبھی میں نے اس کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میں نے سوچا۔ اچھی یا بری بحرحال وہ عورت تو ہوگی۔ اس لئے میں نے پوچھا۔ کتنے دام میں تم اسکو فروخت کرو گے؟

"یہ سن کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ غالباً سوچنے کا بہانہ کرنے لگا۔ جب کوئی پیئے ہوئے ہوتا ہے۔ تو اس بے چارے کا دماغ کام نہیں کرتا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ میں اس کو تولے کے حساب سے فروخت کرونگا۔

"مجھے اس قسم کے انوکھے ذرائع فروخت پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ اسوقت میں بھی نشہ میں دھت ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک تولہ اشاریہ ہزار مکعب کے برابر ہوتا ہے۔ اور مجھے اپنے بیوپار کے لحاظ سے یہ سودا زیادہ مہنگا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

"بحرحال قیمت تو طے کرنی ہی تھی۔ اور اس کا دارومدار مال کے اچھا یا برا ہونے پر تھا۔ اس لئے میں نے کہا —— ایک تولہ کیا حساب دو گے؟

اس نے جواب دیا۔ دو ہزار فرانک فی تولہ۔

اِتنے دام سن کر میں خرگوش کی طرح اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس لئے کہ ایک عمدہ مُسلّم عورت کسی صورت میں تین سو تولہ سے کم وزنی نہیں ہو سکتی۔ مَیں نے کہا۔ یہ دام تو بہت مہنگا ہے۔

اس نے جواب دیا۔ مَیں اس سے کم پر نہیں بیچ سکتا۔ بلکہ مال کے لحاظ سے اس دام پر بھی مجھے گھاٹا آ رہا ہے۔

وہ چونکہ سور کا بیوپار کرتا تھا۔ اس لئے اپنے آپ کو بڑا چالاک سمجھ رہا تھا۔ لیکن میں اس سور کے بیوپاری سے زیادہ چالاک تھا اور اپنے نفع و نقصان کو خوب سمجھتا تھا۔

"ہا۔ ہا۔ ہا" ——— مجھے ہنسی آئی۔ پھر میں نے اس سے کہا۔ دیکھو بھائی۔ اگر عورت برانڈ نیو ہوتی۔ تو میں کچھ نہ کہتا۔ لیکن وہ اتنے عرصے سے تمہارے استعمال میں رہ چکی ہے۔ لہٰذا وہ کافی گھسی جا چکی ہے۔ اس کی موجودہ حالت کے اعتبار سے میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار فرانک فی تولہ کے حساب سے دے سکتا ہوں۔ اس سے ایک دھیلا زیادہ نہیں ——— کیوں یہ دام تمہیں منظور ہیں؟

اس نے جواب دیا۔ اچھا۔ تو مجھے منظور ہے۔ تو پھر دام طے ہیں؟

میں نے حامی بھر لی۔ اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے روانہ ہوئے۔ ہمیں آخر اس دنیا میں ایک دوسرے کے آڑے وقت کام آنا ہی چاہیئے۔

"——— لیکن ایک بات میرے دماغ میں آئی کہ آخر ہم اس عورت کو تولیں گے کس طرح؟ جب تک کہ اس کو کسی رقیق شے میں چھوڑا نہ جائیگا۔

اس نے برجستہ ایک ترکیب بتائی۔ نشہ کی حالت میں اس کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ایک پیپے کو پانی سے بھر دیا جائیگا اور اس کے بعد اس

عورت کو پانی میں ڈال دیا جائیگا۔ اس کے ڈوبنے سے جو پانی پیپے سے باہر نکل کر بہ جائیگا اس پانی کو تول لیا جائیگا۔ اور اس وزن کو ٹھیک ٹھیک تولہ میں منتقل کر کے حساب نکال لیا جائیگا۔

میں نے کہا۔ لیکن جو پانی پیپے سے باہر بہہ جائیگا۔ آخر اس کو کس طرح تولنے کی غرض سے اکٹھا کیا جائیگا؟

تب اس نے دوبارہ تشریح کرتے ہوئے کہا۔ اس صورت میں ہمیں یہ کرنا پڑیگا۔ کہ جب اپنے وزن بھر پانی کو پیپے سے بہا دینے کے بعد جونہی وہ عورت باہر نکلے گی ویسے ہی اس خالی جگہ کو دوبارہ ایک بکٹ سے پانی تول تول کر پانی سے پُر کر دیا جائیگا زیادہ سے زیادہ دس ہیل پانی کا وزن ایک مرلعبہ تولہ ہوگا۔ اس وقت وہ بڑی ذہانت کی باتیں کر رہا تھا۔

بہر حال قصہ مختصر ہم دونوں اس کے مکان پر پہنچے۔ اور میں نے پہلی بار اس کی بیوی کو دیکھا۔ وہ بالکل بدصورت تھی —— سرکار آپ خود ہی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ عورت بدصورت نہیں ہے؟ میں نے دل میں سوچا کہ یہ تو بڑا دھوکا ہوا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ تو کام آہی جائے گی۔ کام چلانے کے لئے ٹھیک ہے۔ عورت چاہے خوبصورت ہو یا بدصورت۔ بات ایک ہی ہے۔

کیوں حضور والا! —— ٹھیک ہے نا؟ میں نے دیکھا کہ وہ بالکل دبلی پتلی مری ہوئی چوہیا کی طرح تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا وزن چار سو بہتر سے زیادہ کسی حالت میں نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد کے واقعات تو حضور والا! اس عورت نے خود ہی بتلا دئے ہیں میں نے اس سے چولی اور موزے اتارنے کو بھی نہیں کہا۔ حالانکہ اس میں سراسر میرا

نقصان تھا۔

آخر جب ساری کارروائی ختم ہوگئی۔ تو وہ بھاگنے لگی۔ میں نے بروماں سے کہا۔ ارے بروماں! اس کو روکو۔ وہ بھاگ رہی ہے۔

اس نے جواب دیا ـــــ گھبراؤ نہیں۔ جائے گی کہاں مُسری؟ میں اسے پکڑ لاؤں گا۔ رات کو سونے تو آئے گی یہیں ـــــ اچھا تو میں اب پانی ناپ ناپ کر بھرتا ہوں۔

ہم لوگوں نے پانی ناپ ناپ کر بھرنا شروع کیا۔ پانی چار بکٹ سے بھی کم ناپ میں اترا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا!

ملزم اتنے زوروں سے ہنسنے لگا۔ کہ دربان نے پیچھے سے پیٹھ میں کوچا دیا۔ وہ خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

قصہ مختصر بروماں نے کہا۔ نہیں یہ ناپ ٹھیک نہیں ہے۔ میں بھی چلا چلا کر لڑنے لگا۔ اس نے مجھے دھکا دیا۔ میں نے اس کے ایک گھونسہ لگا دیا۔ اگر کوئی بیچ بچاؤ نہ کرتا۔ تو شاید یہ دھینگا مشتی آج کے دن تک جاری رہتی۔ کیونکہ ہم دونوں پٹے ہوئے تھے۔ خیریت تو یہ ہوئی۔ کہ اتنے میں پولیس آگئی۔ اور ہم لوگوں کو بلا وجہ پکڑ کر تھانہ میں بند کر دیا۔

حضور والا ـــــ! اس گرفتاری سے میری بڑی ذاتی ہتک اور تذلیل ہوئی ہے۔ لہٰذا پولیس سے مجھے اس بے عزتی کا ہرجہ دلایا جائے"

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔

بروماں ملزم نے بھی اس بیان کی ہو بہو تائید کی۔ اس کے بعد لائق ممبران جیوری صلاح مشورہ کرنے کے لئے چیمبر میں چلے گئے۔

ایک گھنٹہ بعد لائق ممبران جیوری نے اپنا فیصلہ صادر فرماتے ہوئے حقوق نسواں اور معاملات لین دین بہ سلسلۂ تجارت پر تنقید اشراے دیتے ہوئے دونوں ملزمان کو بری کر دیا۔

بردماں ملزم نمبرا اپنی بیوی کو لے کر پھر ازدواجی زندگی کی خوشیاں سمیٹنے کے لئے اپنے گھر چلا گیا۔

——— اور کورنو پھر شراب کی تجارت کرنے لگا۔

———

Ulloo ka Phattah

اُلّو کا پٹھّا

(۱)

"یہی تو دریافت کرنا چاہتا ہوں" ــــــــ میں نے اپنے دوست لابارہ صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا ــــــــ کہ اُس بیچارے مورین کا ذکر ہمیشہ گالی کے ساتھ کیوں کیا جاتا ہے۔ ابھی جو پانچ الفاظ آپ نے فرمائے ہیں کہ وہی اُلّو کا پٹھّا مورین، آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا بغیر اُلّو کا پٹھّا کہے ہوئے مورین کو یاد نہیں کیا جا سکتا ہے؟"

لابارہ صاحب، جو ہمارے شہر کے نامی وکیل تھے۔ میری طرف اُلّو کی سی آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہنے لگے ــــ "تو کیا تم ابھی تک مورین کے قصّے سے واقف نہیں ہو؟ اور لطف یہ کہ جناب اسی شہر لاراافسیل کے نواسی ہیں۔ میں نے کچھ جھجکتے ہوئے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا۔ یہ سن کر لابارہ صاحب نے اپنی دونوں ہتھیلیاں ملتے ہوئے یوں قصہ سنانا شروع کیا۔

"تم مورین کو تو جانتے ہی ہو۔ اور اس کی کپڑا رنگنے کی دکان بھی دیکھی ہے جو

لاراشیل کے نکڑ پر واقع ہے؟

"جی ہاں! خوب جانتا ہوں!"

"اچھا ——— تو آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ ۱۸۶۲ء یا شاید ۱۸۶۳ء میں موریں ہفتہ عشرہ کے لئے گلچھرے اڑانے کی غرض سے پیرس گیا تھا اور بہانہ یہ کر گیا تھا کہ وہ کچھ اپنے اسٹاک کے ردو بدل کے سلسلے میں پیرس جا رہا ہے ——— اب تم خود یہ اندازہ لگا سکتے ہو کہ پیرس جیسے رنگین شہر میں ہفتہ عشرہ کا قیام ایک اجڈ دیہاتی دوکاندار کے لئے کتنا پُر لطف اور متحیر کن ہو سکتا ہے۔ ——— شاید اس کے تصور سے ہی اُس کی نسوں میں دورانِ خون کی رفتار تیز ہو جاتی۔ ہر شام تھیٹر کی سیر ——— سرِ راہ گھومتے ہوئے قدم قدم پر عورتوں کے لباس کی لطیف رومانی رگڑ ——— طبیعت کو بار بار اکسانے والی چھیڑ چھاڑ ——— غرضیکہ یہ رومانی ماحول کسی شخص کو بھی پاگل بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ ہر طرف حسین گول گول پنڈلیاں۔ خوبصورت سڈول گداز کندھے۔ ناچنے والیوں کی ننگی ننگی تھرکتی ہوئی ٹانگیں اور لمبے لمبے گھیرے دار فراک میں ملبوس ایکٹرسیں ——— اور پھر یہ ساری رعنائیاں اس قدر قریب ——— صرف ہاتھ بھر کے فاصلے پر ——— لیکن باوجود اتنا قریب ہونے ہوئے بھی اپنے آپ سے بہت دور سی محسوس ہوتی ہیں۔ اور اتنی ہمت بھی نہیں پڑتی ہے۔ کہ ان کو صرف تھوڑی دیر کے لئے انگلیوں سے چھو ہی لیا جائے۔ وہاں معمولی غذا تو کوئی چکھتا ہی نہیں صبح شام مرغن پر ہی ہاتھ صاف ہوتے ہیں۔ پیرس سے رخصت ہوتے وقت تو دل لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ ایک عجب بے قراری سی محسوس ہوتی ہے اور ہونٹوں پر ایک ایسے تڑپتے ہوئے بے قرار بوسہ کی گدگداہٹ محسوس ہوتی ہے۔ جو کسی کے لبوں پر ثبت ہونے کے لئے تڑپتا ہی رہ گیا ہو۔

موہن کچھ اسی قسم کے رومانی خیالات میں مدغم اسٹیشن پر پہنچا اور لارا شیل سے جانے والی رات کو آٹھ چالیس والی ایکسپریس کا ٹکٹ خرید لیا۔ اس کے بعد وہ وقت گزارنے کے لئے ویٹنگ روم کے اندر باہر چکر کاٹنے لگا۔ اتنے میں اتفاقاً اس کی نظر ایک نوجوان لڑکی پر پڑی۔ جو ایک بڈھی سی خاتون کا الوداعی بوسہ لے رہی تھی۔ اس کے سر پر پڑا ہوا کپڑا کافی ہٹا ہوا تھا۔ اور چہرہ صاف دکھائی پڑ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر موہن بے خود سا ہو گیا اور جوش مسرت میں دل ہی دل میں اس کے حسن کی تعریف کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد معمر خاتون خدا حافظ کہہ کر واپس ہو گئی۔ اور وہ نوجوان دوشیزہ ویٹنگ روم میں چلی گئی۔ اس کے پیچھے موہن بھی ویٹنگ روم میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹہلتی ہوئی پلیٹ فارم پر نکل آئی۔ اور اس کے پیچھے پیچھے موہن بھی باہر نکل آیا۔ غرض کہ وہ جدھر جدھر جاتی موہن بھی اس کے ساتھ ساتھ چپکا رہتا۔ آخر کار وہ ایک خالی ڈبہ میں سوار ہو گئی۔ اور موہن بھی اسی ڈبہ میں سوار ہو گیا۔ اس رات گاڑی میں مسافر بہت تھوڑے سے تھے۔ اور زیادہ تر ڈبے خالی پڑے ہوئے تھے۔ ٹھیک وقت پر انجن نے سیٹی دی اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں اپنا منہ دوسری طرف پھیرے ہوئے بیٹھی ہوئی تھی اور موہن اس کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ لمبا قد صاف شفاف رنگ بڑی بڑی آنکھوں میں شرم و حیا کی جھلک اور عمر زیادہ سے زیادہ ۱۹ سال۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی دونوں ٹانگوں کے گرد ریلوے والا کمبل لپیٹ لیا۔ اور سونے کے ارادے سے سیٹ پر پھیل کر لمبی لیٹ گئی۔

موہن دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ نہ جانے یہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کہاں جائے گی؟ اور اس کے دماغ میں ہزاروں قیاسات اور لاکھوں منصوبے چکر کاٹنے لگے۔ وہ سوچنے لگا ——— لوگ کہتے ہیں کہ دوران سفر میں اکثر رومانی حادثات

پیش آتے ہیں۔ شاید آج میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی حادثہ پیش آنے والا ہے۔ شاید خوش قسمتی آج میرا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ کون جانتا ہے؟ ایسے زرّیں مواقع بہت جلد ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ لہذا اب مجھے جلدی کرنی چاہیئے۔ اور جرأت سے کام لینا چاہیئے۔ داناں کا قول ہے کہ "دلیری —— اور دلیری —— اور ہمیشہ دلیری"۔ —— نہیں۔ نہیں! یہ داناں کا قول نہیں ہے بلکہ میرابو کا قول ہے۔ نہیں اس کا بھی بلکہ —— اور نہ کسی کا بھی ہو۔ اس سے کیا مطلب؟ —— لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ میں تو بالکل ڈرپوک ہوں۔ دلیری تو مجھ میں بالکل نہیں ہے —— کاش کہ انسان ایک دوسرے کے دل کی حالت جان سکتا۔ یقیناً انسان اکثر و بیشتر لاعلمی میں بڑی بڑی خوش قسمتیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ کاش! کہ اس وقت اس لڑکی کی کسی حرکت سے یہ عیاں ہو جاتا کہ وہ بھی وہی چاہتی ہے جو میں چاہتا ہوں۔

بیٹھے بیٹھے وہ شیخ چلی کی طرح ہوائی قلعے بناتا رہا۔ اس کی نظروں کے سامنے تصویریں ناچنے لگیں۔ اس نے دیکھا کہ عشق بازانہ جرأتوں اور خوشامدوں سے اس نے اس لڑکی کا دل موہ لیا ہے اور وہ بالکلیہ اس کی دیوانی اور پرستار ہو گئی ہے۔ پھر پیار محبت کی باتیں شروع ہو گئی ہیں۔ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں حمائل ہو گئی ہیں اور پھر نوبت ایں جاں رسید کہ .... اب آپ جو چاہیں سمجھ لیجیئے!

.... لیکن اسے کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا کہ وہ سلسلہ جنبانی کرے۔ وہ کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اور جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا۔ اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور وہ کچھ کھویا

کھویا سا محسوس کر رہا تھا۔ وہ گھنٹوں اسی حالت میں سمادھی لگائے بیٹھا رہا اور ساری رات اسی عالم انتظار میں گذر گئی۔ حتّے کہ سویرا ہو گیا۔ صبح کی پو پھٹ چکی تھی۔ اور سورج کی پہلی کرن آسمان پر نمودار ہو چکی تھی۔ ایک شوخ کرن نے کھڑکی سے داخل ہو کر اس محو خواب دوشیزہ کے گالوں کو چھیڑنا شروع کیا۔ اور اس کو نیند سے جگا دیا۔ لیٹے لیٹے اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں ملیں۔ اس کے بعد ایک انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ کھڑکی سے باہر ریل کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی زمین کو دیکھا۔ پھر موہن کی طرف گھوم کر دیکھا اور ——— مسکرا دی۔ ایک بشاش بشاش دوشیزہ کی طرح وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے مسکرا پڑی۔ اس قاتلانہ ادا کو دیکھ کر موہن کا سارا جسم تھرتھرا اٹھا۔ یقیناً یہ مسکراہٹ اسی کے لئے تھی۔ اس کو دعوت دی جا رہی تھی ——— ایک ایسا اشارہ کیا جا رہا تھا۔ جس کا وہ بڑی دیر سے منتظر تھا۔ وہ مسکراہٹ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہی تھی کہ تو بالکل چغد ہے۔ الّو کی دُم ہے لعنت ہے تیری مردانگی پر کہ تو رات بھر کھمبے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا ——— میری طرف دیکھ! کیا میں ایک حسین عورت نہیں ہوں؟ اور ——— تو باوجود مجھ جیسی حسین دوشیزہ کے ساتھ رات بھر اکیلا رہنے کے چڑیا کے غلام کی طرح بیٹھا رہا۔ اور ٹس سے مس نہ ہوا ——— ؟

موہن نے پھر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی بلکہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی حماقت پر قہقہے لگا رہی ہے۔ وہ اپنی خفت مٹانے کے لئے کچھ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن باوجود کوشش کے اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی عقل جواب دیتی جا رہی تھی۔ یکایک اس نے اپنے دل میں کہا۔ چاہے کچھ بھی ہو ——— اب میں زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکتا۔ میں اپنی عزت کی بازی لگا دونگا۔

اور یہ سوچ کر بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا۔ اور آسمان پر اڑتی ہوئی چیل کی طرح جھپٹ کر اس لڑکی کو اپنی باہوں میں دبوچ لیا۔ اور چٹاخ سے اس کے گالوں کا بوسہ لے لیا۔

وہ بالکل گھبرا گئی۔ اور چیخ مار کر سیٹ پر سے اچھل پڑی اور چلا چلا کر "مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ" کی آوازیں لگانے لگی۔ دوڑ کر اس نے چلتی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اور باہر کی طرف ہاتھ نکال نکال کر مجنونانہ اشارے کرنے لگی۔ اس اثنا میں موریں کی بھی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ وہ فرطِ جذبات سے پاگل ہو کر ڈبے سے باہر چھلانگ لگانے ہی والی ہے کہ اس نے "میری جان! میری جان کہتے ہوئے دوڑ کر اس کا فراک پکڑ لیا۔

گاڑی آہستہ آہستہ رک گئی۔ اور دونوں گارڈ دوڑ کر اس ڈبے کے پاس پہنچے۔ جہاں لڑکی ابھی تک چیخ چیخ کر ہوا میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں قریب آئے۔ وہ پاگلوں کی طرح کود کر ان کی گود میں گر پڑی۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں بڑبڑانے لگی۔ "یہ شخص چاہتا تھا کہ ...... چاہتا تھا کہ ...... اور یہ کہتے کہتے بے ہوش ہو گئی۔

گاڑی جب اگلے سٹیشن پر پہنچی۔ تو پولیس نے موریں کو گرفتار کر لیا۔ موریں کی بربریت کی شکار اس لڑکی نے ہوش میں آنے کے بعد پولیس کو سارا واقعہ سنایا۔ بے چارا موریں ضمانت مچلکہ بھرنے کے بعد جب گھر واپس آیا۔ تو ایک عورت پر بد اخلاقانہ حملہ کرنے کے جرم میں ایک استغاثہ کی بلا بھی اس کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھی۔

(۲)

اس زمانہ میں میں اخبار "فائل دی شارایت" کا ایڈیٹر تھا۔ اور تقریباً روزانہ

"کیفے دی کامرس" میں موریں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اس حادثہ کی وجہ سے وہ بہت گھبرا گیا تھا۔ اس کو کچھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کہ آخر وہ کیا کرے۔ آخر ایک دن وہ دوڑا دوڑا میرے پاس آیا اور گڑگڑا کر سارا واقعہ بیان کیا۔ میں نے سارا حال سن کر صاف صاف اس سے کہہ دیا۔ کہ تم "اُلو کے پٹھے" ہو۔ کوئی شریف آدمی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ میں اس معاملہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

یہ سن کر وہ رونے لگا۔ گھر پر اس خبر کو سن کر اس کی بیوی نے بھی اس کی بڑی پٹائی کی تھی۔ اسے اپنی عزت خاک میں ملتی نظر آ رہی تھی۔ کاروبار ختم ہو جانے کا خدشہ تھا۔ اور دوستوں کی کنارہ کشی کا ڈر تھا۔ آخر کار اس کی آہ وزاری پر مجھے ترس آ گیا اور میں نے اپنے ایک ظریف دوست کو اس معاملے میں مشورہ کرنے کے لئے بلوا بھیجا۔ جو مسخرا ہونے کے ساتھ بڑا ذہین بھی تھا۔

اس کی رائے یہ ہوئی کہ میں وکیل سرکار سے جا کر خود ملاقات کروں۔ جو اتفاق سے میرا دوست بھی تھا۔ میں نے موریں سے واپس چلے جانے کو کہا اور خود وکیل موصوف سے ملنے روانہ ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ لڑکی جس کی ہتک کی گئی بھی ایک باعزت خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس کا نام پرنیتی بونیل تھا۔ ابھی حال میں اس نے پیرس سے امور خانہ داری کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور ان دنوں چھٹیاں منانے کی غرض سے شہر موخنے میں اپنے چچا اور چچی کے یہاں مقیم تھی۔ جو اس مقام کے کافی باعزت اور متمول سوداگر تھے۔ مشکل تو یہ آن پڑی تھی کہ خود اس کے چچا نے عدالت میں یہ استغاثہ دائر کیا تھا۔ بڑے بحث مباحثہ اور اصرار کے بعد سرکاری افسران اس بات پر تیار ہو گئے۔ اگر یہ استغاثہ اٹھا لیا جائے۔ تو وہ لوگ معاملہ کو دبا دینگے۔ اور مزید کوئی کارروائی نہ کریں گے۔

لہذا ہمیں اس لڑکی کے چچا سے مل کر مقدمہ اٹھوا لینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

میں وہاں سے لوٹ کر موریں کے گھر پہنچا۔ تو دیکھا کہ وہ بالکل پریشان اور نڈھال بیماروں کی طرح بستر پر پڑا ہوا ہے۔ اس کی بیوی بالکل اجڈ قسم کی گنوار لمبی تڑنگی عورت تھی۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ اور اس کی ٹھوڈی پر تھوڑی سی داڑھی بھی تھی۔ وہ برابر اس کو گالیاں بکے جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی ——— اچھا تو آپ اسی الو کے پٹھے موریں سے ملنے آئے ہیں؟ وہ دیکھئے۔ وہاں پڑا ہوا ہے حرامی کا........! اور یہ کہتے ہوئے اندر کا راستہ دکھا دیا۔ اور کولھوں پر ہاتھ رکھ کر مٹکتی ہوئی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے موریں کو جو باتیں دفتر میں ہوئی تھیں بتا دیں۔ یہ سن کر وہ میرے پیر پکڑنے لگا۔ کہ میں جا کر اس لڑکی کے چچا اور چچی سے ملوں۔ یہ بڑا نازک کام تھا۔ لیکن میں تیار ہو گیا۔ وہ بار بار قسم پر قسم کھا کر یہی کہے جا رہا تھا۔ یقین مانئے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کا ایک بوسہ بھی نہ لے پایا...... بالکل نہیں۔ قسم خدا کی......

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ لیکن آپ ہیں بڑے الو کے پٹھے۔ اس نے مبلغ ایک ہزار فرانک کی رقم مجھے دی۔ کہ اس معاملے کو طے کرنے میں جو کچھ خرچ ہو۔ میں اسے اس رقم سے پورا کر دوں۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ کہ میں اکیلا ان صاحبزادوں کے گھر جاؤں۔ چنانچہ میں نے راوٹے کو بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ بڑی مشکل سے وہ اس شرط پر تیار ہوا کہ ہم لوگ فوراً روانہ ہو جائیں۔ تاکہ شام ہونے تک واپس ہو جائیں۔ اس لئے کہ اس رات اس کو کوئی بڑا ضروری کام تھا۔

دو گھنٹہ کی مسافت کے بعد ہم لوگ ایک خوبصورت سے دیہاتی مکان کے

دروازے تک پہنچے - اور گھنٹی بجائی - ایک حسین سی نازنین نے دروازہ کھولا جو یقیناً وہی لڑکی تھی جو مندرجہ بالا واقعات سے منسلک تھی - اس کو دیکھ کر میں نے چپکے سے راوٹے کے کان میں کہا " خوب چیز ہے یہ تو .... اسی لئے تو مورین نے ..."

چچا سانیشتر تونالے ہمارے اخبار 'فانال' کے مستقل خریدار تھے اور ہماری سیاسی پالیسی کے حامی اور مداح تھے - بڑی خندہ پیشانی سے انھوں نے ہم لوگوں کا استقبال کیا اور خوش آمدید کہا - دو ایڈیٹروں کو اپنے گھر پر موجود دیکھ کر وہ پھولے نہیں سمارہے تھے - یہ دیکھ کر راوٹے نے میرے کان میں آہستہ سے کہا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اُلو کے پٹھے مورین کا معاملہ طے ہو جائیگا -

صاحبزادی صاحبہ کے کمرے سے رخصت ہوجانے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے نازک گفتگو کا سلسلہ چھیڑا - اس حادثہ سے جس رسوائی اور بدنامی کا ڈر تھا - اس کا پورا خاکہ میں نے ان کے ساتھ کھینچ دیا - میں نے انہیں بتایا کہ اگر یہ قصہ عام ہوگیا - تو یقیناً بڑی سبکی اور ذلت کی صورت پیدا ہو جائے گی - کیونکہ کوئی شخص بھی یقین نہ کرے گا کہ معاملہ صرف بوسہ بازی کی حد تک ہی رہ گیا - وہ بیچارے شش و پنج میں پڑ گئے اور اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں کچھ فیصلہ نہ کرپائے کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے - ان کی بیوی کہیں باہر گئی ہوئی تھی - اور کافی رات گئے گھر واپس ہونے والی تھی - سوچتے سوچتے انہیں ایک امید افزا صورت نظر آئی - اور انہوں نے کہا ــــــ دیکھئے ! ایک صورت سمجھ میں آگئی ہے - آپ لوگ رات کا کھانا یہیں تناول فرمائیں اور رات کو یہیں قیام بھی فرمائیں - جب میری بیوی یہاں ہوگی تو معاملات پر غور کیا جائے گا -

راوٹے نے پہلے تو انکار کیا - لیکن پھر اس اُلو کے پٹھے مورین کا خیال کرکے

رکنے پر راضی ہو گیا اور ہم لوگوں نے قیام و طعام کی دعوت منظور کر لی۔ اس کے بعد چچا محترم خندہ پیشانی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی بھتیجی کو آواز دی۔ اس کے بعد یہ صلاح دیتے ہوئے کہ ہم لوگ کچھ دیر باغ میں چہل قدمی کریں۔ کہا کہ اچھا تو اب اہم معاملات پر گفتگو کل سویرے تک ملتوی رہے گی۔ راوئے اور ان کے درمیان کچھ سیاسی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا اور میں ان صاحبزادی کے ساتھ کچھ پیچھے رہ گیا۔ وہ واقعی بڑی حسین تھی اور اس کے حسن میں کافی کشش تھی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اسی واقعہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بالکل گھبرائی ہوئی نہیں نظر آ رہی تھی اور بڑے اطمینان سے گفتگو کا لطف اٹھا رہی تھی۔

میں نے اس سے کہا ـــــــــ "خاتون! ـــــــــ ذرا خیال تو فرمائیے کہ یہ آپ کے لئے کتنا برا ہو گا؟ آپ کو کمرہ عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ پھر اسی بدمعاش کی نگاہوں سے نگاہیں ملانی پڑینگی۔ اور اتنے لوگوں کی موجودگی میں ریل کے اس شرمناک واقعہ کو دُہرانا ہو گا۔ کیا آپ کے لئے یہ بہتر نہ ہوتا ہوتا کہ آپ کسی شخص کو مدد کے لئے پکارے بنا اس بدمعاش کو دھکا دے کر پرے گرا دیتیں اور اتنا شور و شر نہ مچاتیں اور اس کے بعد اسٹیشن آنے پر ڈبہ بدل لیتیں"۔ یہ سُن کر ہنستے ہوئے اس نے کہا۔ آپ بجا فرما رہے ہیں۔ لیکن میں کیا کرتی۔ میں تو بالکل گھبرا سی گئی تھی اور گھبراہٹ میں عقل جواب دے جاتی ہے۔ جونہی میں نے معاملات پر غور کیا مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ آپ اس امر کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ وہ پاگل بغیر کچھ کہے سنے مجھ پر دیوانوں کی طرح جھپٹ پڑا۔ میں کچھ سمجھ نہ سکی کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟

وہ بغیر کسی خاص جھجک اور لحاظ کے برابر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری طرف دیکھ رہی تھی اور باتیں کرتی جا رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا۔ یہ بڑی بیباک لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے میں یہ حماقت کر بیٹھا میں نے ہنستے ہوئے مذاق کے پیرائے میں اس سے کہا —— "خاتون! آپ کو ماننا پڑے گا۔ وہ بے چارہ قابل معافی ہے۔ اس لئے کہ آپ جیسی حسینہ کا نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے کسی شخص کے دل میں آپ کا بوسہ لینے کی خواہش کا پیدا ہونا ناممکن بات ہے"۔

وہ بڑے زور سے ہنس پڑی اور کہنے لگی —— "جناب! خواہش اور عمل کے درمیان شرم و حیا کا بھی تو کوئی مقام ہے"...... یہ کچھ عجیب سا جملہ تھا اور میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا —— "اچھا فرض کیجیے۔ میں اسوقت آپ کا منہ چوم لوں تو آپ کیا کہیں گی؟" —— وہ ٹھٹھک کر رک گئی اور مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے کہا —— "اوہ ... آپ..... خیر آپ کی بات دوسری ہے"۔

میں اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ میری بات "دوسری" کیوں تھی۔ اس لئے کہ قرب و جوار میں میں خوبصورت لابارہا کے نام سے مشہور تھا اور میری عمر اسوقت فقط ۲۰ سال کی تھی۔ باوجود اس کے میں نے پوچھا —— "کیوں...... میری بات دوسری کیوں ہے؟"

اس نے کاندھا مٹکاتے ہوئے کہا —— "اس لئے...... اس لئے کہ آپ اس کی طرح الو نہیں نظر آتے"! —— اور پھر حیرانی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا...... اور نہ اتنے بدصورت!

قبل اس کے کہ وہ مجھ سے پرے ہونے کی کوشش کرتی ۔ مَیں نے جُھک کر چٹاخ سے اس کے گالوں کے بوسے لیا ۔ وہ اچک گئی ۔ لیکن وقت گذر چکا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ آپ بڑے وہ ہیں ...... آپ کو شرم نہیں آتی ۔ پھر ایسا نہ کیجئے گا ۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

میں نے خاکسارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نیچی آواز میں کہا ۔ کاش کہ میرا بھی مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ۔ جس طرح موریں کا پیش ہونے والا ہے ۔

کیوں ——— ؟ اُس نے پُوچھا ۔

اس کو گھورتے ہوئے میں نے کہا ——— کیونکہ آپ بہت خوبصورت اور حسین ہیں ۔ اس لیئے آپ پر دست اندازی کرنا میرے لیئے باعثِ فخر اور باعثِ عزت ہے ۔ اور آپ کو ایک نظر دیکھ کر ساری دُنیا یہی کہتی کہ واقعی لا بار ہا اس انعام کا مستحق ہے ۔ جو اس نے حاصل کیا ہے ۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ !

وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ اور کہنے لگی ۔ آپ بھی عجب احمق ......

ابھی اس نے لفظ احمق پورا ادا بھی نہ کیا تھا کہ مَیں نے بڑھ کر اس کو اپنی باہوں میں دبوچ لیا ۔ اور جہاں جہاں موقعہ ملا ۔ اس کے جسم کے ہر حصہ کو بے تحاشا چُومنے لگا ۔ پیشانی پر ۔ گالوں پر ۔ آنکھوں پہ ۔ لبوں پر ۔ غرض کہ کوئی جگہ چھوڑی نہیں ۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کچھ حصّے چھپانے کی کوشش کرتی رہی ۔ لیکن اسی کوشش میں دوسری جگہیں نمایاں ہو جاتی تھیں ۔ اور موقعہ ملتے ہی میں انہیں بھی چُوم لیتا تھا ۔ آخر کار بڑی کشمکش کے بعد اس نے اپنے آپ کو چھڑا لیا ۔ کچھ خفا سی اور کچھ شرمائی ہوئی سی اس نے کہا ——— آپ بڑے خراب آدمی ہیں ؟ میں

ناحق آپ کی باتیں سننے لگی۔

مَیں نے گھبراہٹ میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور ہکلاتے ہوئے کہنے لگا ——
مجھے معاف کر دیجئے خاتون! —— مَیں نے بڑی زیادتی کی۔ میں نے آپ سے وحشیوں کا سا سلوک کیا۔ خدا کے لئے معاف کر دیجئے۔ اگر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ..... میں بیکار کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بولی میں یہ سب کچھ نہیں جانتی .... اتنے میں مجھے ایک بڑا اچھا بہانہ ہاتھ آیا۔ میں نے کہا ——

"خاتون! میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔

وہ واقعی کچھ گھبرا سی گئی اور میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ میں کہتا چلا گیا —— ہاں خاتون! —— ہاں!! ...... خدا کے لئے دھیان سے سنیئے میں موریں کو بالکل نہیں جانتا اور نہ مجھے اس کی کوئی پرواہ ہے۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس پر مقدمہ چلے یا نہ چلے۔ وہ اس دوران میں حوالات میں پڑا اسٹر رہا ہے یا نہ بھاڑ میں جائے موریں —— میں نے آپ کو گذشتہ سال یہاں دیکھا تھا اس وقت سے آپ کا دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اور باوجود کوششوں کے آپ کو بھلا نہ سکا۔ چاہے آپ اس بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔ میں خیالوں میں آپ کی پوجا کرنے لگا اور آپ کے فراق میں اتنا بیتاب ہو گیا کہ بغیر ملاقات کے چین نصیب ہوتا نہ معلوم ہوا۔ آخر کار آپ کو دیکھنے اور ملاقات کا یہ بہانہ تلاش کیا۔ اور موریں کے واقعہ نے اس کا موقعہ عطا کیا۔ اب مَیں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ حالات نے مجھے اس وقت یہ بدتمیزی کرنے کی ترغیب دی۔ میں نہایت شرمندہ ہوں۔ اور امید ہے کہ آپ درگذر فرما دیں گی۔

اس کو میری آنکھوں میں کچھ سچائی کی جھلک معلوم ہوئی۔ اور اس کے لبوں پر کچھ ہنسی سی آنے لگی۔ اس نے ہنسی کو دباتے ہوئے بڑے شوخ انداز میں کہا ——

"جھوٹے کہیں کے ...."

میں نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے بڑے پُر خلوص لہجے میں کہا —— قسم خدا کی! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ (واقعی اس وقت میرے دل میں خلوص تھا)

"واقعی" —— اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

اس وقت ہم دونوں بالکل اکیلے تھے۔ راوئے اور اس کا چچا گھومتے گھومتے ایک طرف روش میں غائب ہو گئے تھے۔ اور سناٹا دیکھ کر میں نے جی کھول کر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو دبوچ لیا اور دیوانگی سے چومنے لگا۔ وہ بالکل خاموش میری باتیں سننے لگی۔ اور غالباً کچھ تصفیہ نہ کر پائی۔ کہ کہاں تک میری باتوں کا اعتبار کرے۔ میں اتنا بے خود ہو گیا تھا کہ آخر میں مجھے احساس ہونے لگا کہ میں واقعی سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور گلا بالکل خشک ہو گیا تھا۔ بدن میں تھرتھری سی ہو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کی کمر کے گرد اپنی باہیں حائل کر دیں۔ اور دھیرے دھیرے اس کے کانوں میں رس گھولنے لگا۔ وہ بالکل مردہ کی طرح ساکت اور خاموش کھڑی تھی۔ جیسے میری باتوں میں کھو سی گئی ہو۔

رفتہ رفتہ اس کی اُنگلیاں میری انگلیوں میں پیوست ہونے لگیں اور اس نے انہیں دبانا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی باہیں اور بھی تنگ کر لیں اور دھیرے دھیرے اس کو اپنے سینے سے بالکل چمٹا لیا۔ وہ بالکل ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس کے گالوں کو اپنے لبوں سے چھو لیا اور دفعتاً اس کے لب خود ہی میرے لبوں سے پیوست ہو گئے۔ ایک طویل بوسہ .... بڑی دیر تک ہمارے لب جدا نہ ہوئے۔ اور شاید کچھ دیر تک اور یہ معاملہ چلتا۔ کہ اتنے میں پیچھے سے کسی کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ وہ تڑپ کر ایک جھاڑی میں گھس گئی۔ اور میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نو راوئے بیچ روش

میں چلا آرہا تھا۔ اس نے بغیر مسکرائے ہوئے کہا۔ اچھا ——— تو یہ معاملہ ہے

——— یہ طریقہ نکالا ہے۔ جناب نے اس الّو کے پٹھے موریں کا معاملہ

طے کرنے کا ......! میں نے جواب دیا ——— ارے بھائی سب کچھ کرنا پڑتا

ہے۔ مگر چچا صاحب کہاں ہیں؟ کیا گفتگو رہی ہے ان سے؟ خیر ——— بھتیجی

کا قصہ تو میں بتلاؤنگا۔

کوئی خاص کامیابی کی صورت تو نہیں نظر آرہی ہے۔ اس نے جواب دیا اور

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر کی طرف چلے گئے۔

(۲۳)

ڈنر پر میرا دماغ اور بھی گھوم گیا۔ ٹیبل پر میں بالکل اس کے برابر بغل میں بیٹھا

ہوا تھا۔ بار بار اس کی کہنیاں میری کہنیوں سے رگڑ کھا رہی تھیں ٹیبل کے نیچے

برابر میرے پیر اس کے پیر سے ٹکرا رہے تھے اور بار بار نگاہیں مل رہی تھیں۔

کھانے کے بعد چاندنی رات میں ٹہلنے کے لئے ہم لوگ باغ میں نکل آئے۔ ہم

دونوں قصداً کچھ پیچھے رہ گئے۔ چلنے میں میں نے اس کو اپنے سے بالکل چپکا لیا تھا اور

میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا۔ جب بھی موقعہ ملتا۔ میں اس کو چوم لیتا۔ اور اس کے ہونٹوں

کو اپنے بھیگے ہوئے ہونٹوں سے تر کر دیتا تھا۔ اس دوران میں راوئے اور چچا محترم

ہمارے آگے آگے کچھ دوری پر چل رہے تھے۔ تھوڑی دیر کی چہل قدمی کے بعد ہم لوگ

اندر چلے گئے۔ جہاں ایک نوکر اس کی چچی کا تار لے کر آیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ

سویرے سات بجے کی گاڑی سے واپس آنے والی ہیں۔

"اچھا ——— اب ہرمتی" چچا نے بھتیجی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

جا کر آپ لوگوں کو سونے کے کمرے دکھا دو۔ پہلے اس نے راوٹے کو سونے کا کمرہ دکھایا۔ راوٹے نے آہستہ سے میرے کان میں کہا —— کیا مضائقہ تھا۔ اگر پہلے تم کو سونے کے کمرے تک پہنچایا گیا ہوتا۔ اس کے بعد وہ مجھے میرے کمرے کی طرف لے چلتی۔ جونہی ہم دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اس کو اپنی گود میں لے لیا اور اس کے احساسات کو چھیڑنے لگا۔ وہ برابر بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن میں اس کو برابر جھنجھوڑتا ہی رہا۔ آخر کار جب اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ تو وہ تڑپ کر علیحدہ ہو گئی۔ اور کمرے سے بھاگ گئی۔ اور میں کچھ گھبرایا ہوا سا بستر میں گھس گیا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو بالکل احمق محسوس کرنے لگا۔ نیند تو شاید ہی آتی۔ ابھی میں اپنی حماقتوں پر غور کر رہی رہا تھا کہ دروازہ پر دستک کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا "کون؟"

"میں ——!" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

میں نے جھٹ پٹ کپڑے پہنے اور دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ گئی۔ اور پوچھا۔ "میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گئی۔ کہ آپ سویرے کیا پیتے ہیں؟ کوکو۔ چاء یا کافی؟" میں نے پھر اس کو دھر دبوچا اور یہ کہتے ہوئے کہ "میں کیا پیتا ہوں؟ —— میں کیا پیتا ...... ؟" اس کے لبوں پر مسلسل بوسوں کی بارش شروع کر دی۔ وہ تڑپ کر میری آغوش سے علیحدہ ہو گئی۔ اور موم بتی کو پھونک مار کر بجھاتی ہوئی کمرہ سے بھاگ گئی۔ میں اندھیرے میں بالکل اکیلا رہ گیا اور کافی دیر تک دیا سلائی ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ بڑی دقتوں سے دیا سلائی کی ڈبیہ میرے ہاتھ آئی۔ میں نے فوراً موم بتی روشن کی۔ اور اس کی روشنی میں راستہ ڈھونڈتا ہوا باہر برآمدے میں نکل آیا۔

میں کہاں جا رہا تھا؟ یہ سوچنے کی میں نے کوشش ہی نہیں کی۔ بس میں اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اور امید تھی کہ وہ کہیں نہ کہیں کسی کمرے میں مل ہی جائے گی۔ بغیر

کچھ جانے بوجھے کچھ دور تک میں چلتا رہا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ اگر کہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے چچا کے کمرے میں گھس پڑا۔ تو کیا عذر پیش کرونگا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ کہہ دُونگا کہ کچھ اہم گفتگو کرنے کے لئے رادھے کا کمرہ تلاش کر رہا تھا۔ پھر میں سارے دروازہ کا معائنہ کرنے لگا۔ کہ کہیں تو اس کا دروازہ نظر آجائے گا۔

آخر کار میں نے ایک دروازہ کا دستانہ گھمایا۔ اور اندر کی طرف داخل ہُوا تو دیکھا کہ ناہر نیتی بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور حیرت سے میری طرف تک رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اندر کی طرف سے کنڈی لگا دی۔ اور پنجوں کے بل چلتا ہُوا اس کے قریب پہنچ کر کہا ــــ خاتون ــــ! سوتے وقت کچھ دیر پڑھنے کے لئے میں آپ سے کوئی کتاب مانگنا بھول گیا۔ اگر تکلیف نہ ہو تو کوئی کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ اب میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں نے اس کے بعد اُس رات کون سی کتاب پڑھی۔ وہ داستانِ عشق الف لیلےٰ کے رومانوں پیار، محبت کی کہانیوں اور سازِ الفت کے نغموں سے معمور اور لبریز تھی۔ میں نے اس کتاب کا پہلا ورق الٹ دیا ــــ اس کے بعد اوراق خود بخود الٹتے چلے گئے ــــ

ایک ــــ دو ــــ چار ــــ غرض کہ باب کے باب ختم ہوتے چلے گئے۔

یہاں تک کہ ــــ شمع جل کر راکھ ہو گئی۔

داستانِ عشق کے اختتام پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کی طرف دبے دبے پاؤں واپس ہونے لگا۔ راستہ میں کسی نے اندھیرے میں پیچھے سے مجھے پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے میرے کان میں کہا ــــ اچھا دوست! یہ بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی آپ نے پوری طرح اس الو کے پٹھے موریں کا معاملہ طے نہیں کیا؟ ــــ یہ آواز رادھے کی تھی۔

سویرے سات بجے وہ خود ہی ایک پیالہ چائے کا لے کر میرے پاس آگئی۔ اس سے

زیادہ لذیذ چائے میں نے زندگی میں پھر کبھی نہیں پی - ہلکی ہلکی خوشبو والی خوش ذائقہ اِتنی لذیذ چائے تھی کہ پیالہ سے ہونٹ نہیں ہٹتے تھے - ابھی وہ کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ راؤ ئے آگیا - وہ کچھ گھبرایا ہوا اور چڑچڑا دکھائی دے رہا تھا - اس نے کسی قدر بگڑ کر مجھ سے کہا "اگر آپ یہی کرتے رہے جو کر رہے ہیں - تو اس اُلو کے پٹھے موریں کا معاملہ اور بھی گڑبڑ ہو جائے گا -

آٹھ بجنے بجے چچی صاحبہ تشریف لائیں - مختصر سی گفتگو کے بعد وہ لوگ مقدمہ اٹھانے پر تیار ہو گئے - اس شرط پر کہ وہ اُلو کا پٹھا بطور حرجہ ۵۰۰ فرانک ادا کرے اور یہ رقم گاؤں کے غریبوں کی امداد کے فنڈ میں دے دی جائے - میں نے فوراً یہ رقم جیب سے نکال کر ادا کر دی - ان لوگوں کا بہت اصرار ہوا - کہ ہم لوگ اس روز بھی رک جائیں اور سارا دن کچھ تاریخی مقامات کے دیکھنے سیر و تفریح اور پکنک میں گذارا جائے - ہرنیتی بھی اپنے چچا کی پیٹھ کے پیچھے سے دوسرے لوگوں کی نظریں بچا بچا کر اشارے کر رہی تھی کہ میں رک جاؤں - لیکن راؤ ئے راضی نہیں ہوا - میں نے اکیلے میں لے جا کر اس کی بڑی خوشامد بھی کی کہ وہ رکنے پر تیار ہو جائے - لیکن وہ نہیں مانا - اور بار بار یہی کہتا رہا - معاف فرمائیے ——— ! جناب ! میں اس اُلو کے پٹھے موریں کے معاملے سے بالکل بیزار ہو چکا ہوں -

مجبوراً مجھے بھی جانا پڑا - رخصت ہوتے وقت مجھے بہت برا معلوم ہوا - کاش کہ میں عمر بھر اس معاملے کو طے ہی کرتا رہ جاتا - جب آخری بار اس سے ہاتھ ملا کر ریل پر سوار ہوا تو وہ بالکل خاموش اور ساکت کھڑی تھی - اور ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف تک رہی تھی - اتنے میں گاڑی چل پڑی - میں نے راؤ ئے سے کہا ——— دوست ! تم بڑے ظالم ہو - اس نے جواب دیا - بھائی جان ! ——— بات دراصل یہ ہے کہ اس آنکھ مچولی

سے کچھ میرے احساسات بھی اُبھرنے لگے تھے۔

جب ہم واپس فانال کے دفتر پہنچے۔ تو ایک جم غفیر ہم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ ہر شخص نے پوچھنا شروع کر دیا۔ کیا آپ لوگوں نے اس الو کے پٹھے مورین کا معاملہ طے کر دیا؟ سارا لاراشیل اس خبر کو سننے کے لئے بیتاب تھا۔ اس دوران میں راؤ نے اپنے بے درد ردّیہ پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے ہنسی دباتے ہوئے کہا۔ جی ہاں ہم لوگوں نے معاملہ طے کر دیا ہے اور اس کامیابی کا سہرا لابار صاحب کے سر ہے۔ اس کے بعد ہم مورین سے ملنے چلے۔

وہ بالکل صدمہ سے نڈھال چپ چپ آرام کرسی پر پڑا برسوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پیروں پر پلاستر بندھا ہوا تھا۔ اور سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ وہ اس طرح کھانس رہا تھا۔ جیسے اب دم نکلنے ہی والا ہے۔ اس کی بیوی شیرنی کی طرح جھپٹ پڑنے والے انداز میں بیٹھی ہوئی اس کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی۔ جیسے ابھی کچا نگل جائے گی۔ جونہی اس نے ہم لوگوں کو آتے دیکھا۔ ہاتھ پاؤں ہلا کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کو کھڑا ہونے سے منع کرتے ہوئے کہا ——— اُٹھیں کے ——— ہم لوگوں نے بڑی مشکلوں سے تمہارا معاملہ طے کر دیا ہے۔ لیکن اب کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اور میرے ہاتھوں کو ایسے چومنے لگا جیسے وہ کسی شہزادے کے ہاتھ ہوں۔ زور زور سے رونے لگا۔ حتیٰ کہ تقریباً بے ہوش ہو گیا۔ پھر اس نے راؤ کو گلے سے لگا لیا۔ خوشی میں پاگل ہو کر اس نے بیوی کو پیار کر لیا۔ جس نے الٹ کر اس کو ایسا دھکا دیا۔ کہ وہ دھڑام سے کرسی پر گر پڑا۔ باوجود انتہائی کوشش کے وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ اس کے دماغ پر اس ذلت

اور بے عزتی کا بہت بُرا اثر ہوا۔ سارے قرب وجوار کے لوگ اس کو اُلّو کا پٹھا مورین کے نام سے پکارنے لگے۔ اور جب بھی وہ یہ گالی سنتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی تلوار اس کے جسم کے آر پار ہو گئی ہو۔ گاؤں کے لونڈے اس کے پیچھے تالیاں پیٹنے لگے تھے اور کوئی شخص بھی اس کے پیچھے 'اُلّو' کہہ دیتا۔ تو وہ عادتاً اس آواز پر پیچھے گھوم پڑتا تھا۔ اس کے تمام دوستوں نے بھی اس سے بڑا بے ہودہ مذاق کرنا اور تنگ کرنا شروع کر دیا۔

جب کبھی وہ سور کا گوشت کھاتے ہوتے تو اس سے کہتے کہ یہ تمہارے جسم کا ایک جزو ہے۔ آخر کار وہ اس بے عزتی کے صدمے سے جانبر نہ ہو سکا اور دو سال بعد مر گیا۔

اب میرا قصہ سنیئے! ۱۸۷۵ء میں جب میں چیمبر آف ڈپوٹیز کا الکشن لڑ رہا تھا۔ تو میں نوٹیری آف فانکیری کے نئے انچارج سانیشر بولینیل سے ملنے اور ان کا ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے ان کے گھر گیا۔ ایک خوبصورت سی لمبی اور خوش لباس خاتون نے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

شاید ——— آپ نے مجھے بھلا دیا؟

میں نے کچھ رک رک کر کہا ——— نہیں ——— نہیں! لیکن آپ کا ——— ؟

"ہرنیتی بونیل"

"آخاہ ——— آپ" ——— اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا چہرہ پیلا پڑ گیا ہو۔ لیکن وہ بڑے اطمینان سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اور مسکرا رہی تھی۔

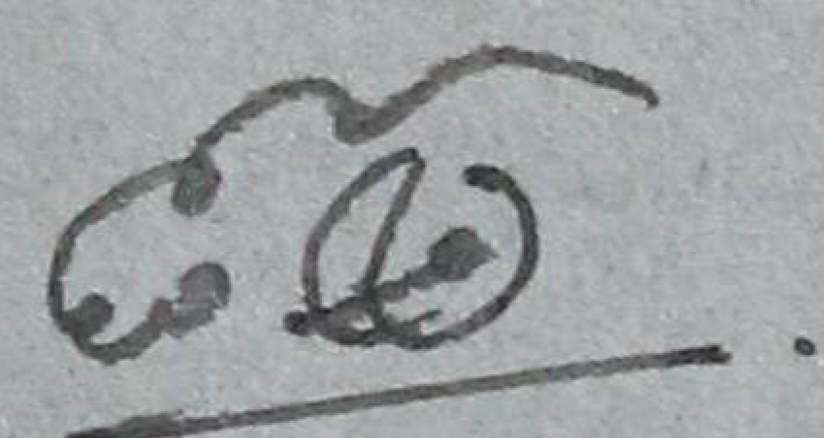
جب وہ مجھے اپنے شوہر کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تو اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اور ان کو بڑی سختی کے ساتھ دباتے ہوئے کہا ———

میں آپ سے بہت دنوں سے ملاقات کرنے کا ارادہ کر رہا تھا ——— جناب

——— اس لیئے کہ میری بیوی نے آپ کا بار بار ذکر کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔

کہ کیسے عجیب و غریب حالات میں آپ میری بیوی سے متعارف ہوئے تھے اور آپ نے انتہائی دانائی فراست اور شرافت سے کام لے کر بڑی خوبی سے اس نازک مسئلے کو حل کیا تھا .... یہ کہتے ہوئے وہ کچھ رُک سا گیا اور پھر آہستہ سے دبی ہوئی آواز میں اس طرح کہا۔ جیسے وہ کوئی بہت نیچی اور شرمناک بات کہہ رہا ہو۔ میرا مطلب ہے۔

——— اس اُلّو کے پٹھے موریں والے معاملے میں ......



KA'AT OUT OR
CUT OUT

کاٹ آوٹ

گذشتہ موسمِ گرما گذارنے کی غرض سے ویانیس کے ایک امیر و کبیر خاندان کی ایک نہایت ہی حسین و جمیل خاتون ایک جنّت نظیر پہاڑی مقام پر تشریف لے گئیں اور طبقہ امرا کے عام رواج کے مطابق ان کے ساتھ ان کے شوہر اس سیر و تفریح کے مقام پر تشریف نہیں لے گئے۔

خاندان کی قابل قدر روائیتوں کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ مال و دولت کی اہمیّت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس خاتون نے اپنے خاندان کی دیرینہ روائیتوں کے مطابق ایک نوجوان امیر و کبیر رئیس وقت سے شادی کی تھی۔ لیکن اس قسم کی پابند اور اصولی شادی میاں بیوی کے دلوں میں محبت کی جڑیں مضبوط کرنے میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ چنانچہ خاندانی جاہ و حشمت اور دولت و عزت کا ایک وارث پیدا کرنے کے بعد اور اپنے شوہر کی خواہشات کو ذمہ دارانہ طور پر پوری کر دینے کے بعد دونوں میاں بیوی نے جداگانہ راہیں اختیار کر لیں۔ جواں سال اور عیش پسند شوہر نے

نائٹ کلب۔ ریس کورس اور ناٹکوں کی پس پردہ رنگینیوں میں اپنے آپ کو کھو دیا اور پیکر حسن بیوی نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات ناچ گھروں۔ سیر و تفریح کے مقامات اور پہاڑوں کی برفانی تفریح گاہوں کے لئے وقف کر دئے۔

اب کی بار جب کہ وہ پہاڑ سے ... لوٹیں تو اپنے ساتھ ایک اعلےٰ خاندان کے ایک نہایت ہی خوبصورت پولش نوجوان کو بھی نتھی کر لائیں۔ یہ نوجوان اس بری طرح خاتون محترم پر عاشق ہوا کہ اپنی معشوقہ کے اشاروں پر دیوانہ وار آنکھیں بند کر کے ناچنے لگا۔

موقعہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خاتون محترم نے ویانیس کے دور دراز گرد و نواح میں ایک چھوٹا سا خوبصورت مزین و آراستہ بنگلہ کرایہ پر لے لیا اور چھپ چھپ کر اس مکان کی چار دیواریوں میں اپنے عاشق سے رنگ رلیاں منانے لگیں۔ آرائیش حسن و جمال اور انتخاب لباس میں تو خاتون محترم کو خاص ملکہ حاصل تھا اور اس کا مذاق نہایت اعلےٰ تھا۔ روزانہ وہ طرح طرح کے لباس زیب تن کیا کرتی تھیں۔ جب وہ آپیرا کی ..... نہ اپسراؤں کا لباس پہن لیتیں تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے رنگین کپڑوں کی سلوٹوں سے موسیقی کی لہریں اٹھ رہی ہوں۔ اور نغمات کے سوتے اُبل رہے ہوں۔ یونان کے قدیم کلاسکی لباس میں تو وہ بالکل حسن کی دیوی وینس دکھائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ ایسے کپڑے پہن لیتی تھیں۔ جن میں وہ بالکل صحرائے عرب کے کسی سلطان کی حرم سرا کی نہایت حسین و جمیل کنیز نظر آتی

تھوڑے ہی عرصہ میں موسم سرما کے آتے آتے وہ ان چوری چھپی کی ملاقاتوں سے اکتا سی گیئں۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ کچھ اس طرح کا انتظام ہو جائے کہ وہ دونوں

اطمینان اور سکون کے ساتھ زیادہ سے زیادہ لمحاتِ عیش و عشرت ایک دوسرے کی صحبت میں بسر کر سکیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وہ دونوں گھڑی بھر کے لئے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ رہیں۔ اور مکمل آزادی کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہ سکیں۔ لیکن یہ آخر کس طرح ممکن تھا؟

مگر یہ کوئی زیادہ پیچیدہ مسئلہ ثابت نہ ہوا۔ عورت کے لئے کوئی مشکل مشکل نہیں ہے۔ عورت ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ چنانچہ دو ایک روز دماغ پر زور دینے کے بعد خاتون محترم نے اس مسئلہ کو بڑی خوبی سے حل کر لیا۔ اور ایک شاطر کھلاڑی کی طرح بساط پر مہرے جما کر اپنا نقشہ بٹھا لیا۔

پولش نوجوان کی شکل و صورت ذرا عام قسم کے نوجوانوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے حسن میں کافی نسوانیت تھی۔ اس کا قد درمیانہ تھا۔ جسم سبک و نازک لیکن گداز۔ ناک نقشہ بالکل عورتوں جیسا۔ اور اگر اس کو زنانے کپڑے پہنا دیئے جاتے۔ تو اس کے ایک حسین نازنین ہونے پر کسی کو شک و شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر اس قدر نسوانیت تھی کہ ہونٹوں پر وہ بھاری پن تک نہ تھا جو مردانہ ہونٹوں کی خاص پہچان ہے۔ ان زنانی خصوصیات کی موجودگی میں خاتون محترم نے اس نوجوان سے کہا کہ وہ زنانہ لباس پہننا اختیار کرے۔ تاکہ دیکھنے میں وہ ایک نوجوان الھڑ دوشیزہ نظر آئے۔ اور بغیر کسی روک ٹوک کے آزادی کے ساتھ جس گھڑی چاہے اپنی معشوقہ سے بے دھڑک ملاقات کر سکے۔ اتفاق سے موسم بھی سردیوں کا تھا۔ اور گرم اور بھاری کپڑوں نے اس روپ کو بدلنے میں اور بھی معاونت کی۔ خاتون محترم نے فوراً اپنے عاشق زار کے لئے قیمتی اور نہایت ہی فیشن ایبل زنانہ کپڑے سلنے کے لئے آرڈر دے دیا۔ اور اس دوران میں اپنے شوہر سے ذکر کر دیا۔

کہ اس کی ایک نہایت ہی عزیز اور بے تکلف سہیلی جس سے اس نے گذشتہ موسم گرما میں تفریح گاہ پر نئی نئی دوستی پیدا کی تھی ۔ موسم سرما گذارنے کے لئے وہاں آئی ہوئی ہے ۔ اور اس سے اکثر و بیشتر ملاقات کرنے کے لئے ان کے یہاں آتی رہیں گی ۔ شوہر نے نہایت لاپروائی کے ساتھ اس خبر کو سنا ۔ کیونکہ اس نے اپنا یہ اصول بنالیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی سہیلیوں میں سے کسی سے بھی عشق نہیں لڑائے گا ۔ رات میں وہ حسب معمول نائٹ کلب چلا گیا اور نوجوان پولش دوشیزہ کی آمد کے بارے میں جلد ہی سب کچھ بھول گیا ۔

صاحب خانہ کے جانے کے آدھ گھنٹہ بعد ہی ایک بند گاڑی محل میں داخل ہوئی ۔ اور اس میں سے ایک دبلی پتلی اور لمبی سی نرم و نازک خاتون چہرہ پر نقاب کھسکائے ہوئے بھاری بھاری کپڑوں میں ملبوس اتری اور نرم و گداز قالینوں سے ڈھکی ہوئی سیڑھیوں پر سے گذرتی ہوئی اندر کی طرف چلی گئی ۔ اس حسین نازنین کے لباس میں چھپا ہوا وہی خاتون محترم کا عاشق زار تھا ۔ پولش نوجوان بہت جلد زنانے کپڑوں کا عادی ہو گیا ۔ اور کچھ اتنی دلچسپی اور مہارت سے اپنا زنانہ پارٹ ادا کرنے لگا کہ نہایت تیزی سے شہر کے عیش پسند امرا کی حریص اور للچائی ہوئی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگیں ۔ اس ناٹک میں اسے واقعی لطف آنے لگا ۔ اور مردوں کو الّو بنانے اور تنگ کرنے میں اُسے اس نسوانی لذّت کا احساس ہونے لگا جو عموماً عورتوں کو مردوں کو تڑپانے اور جلانے میں محسوس ہوتی ہے ۔

نوجوان آئے دن نت نئے گل کھلانے لگا ۔ اور خوب جی بھر کر آنکھیں لڑانے لگا ۔ ایک رات وہ ایک آپرا کے مخصوص باکس میں چلا گیا ۔ اس نے نہایت دل کش فراک پہن رکھی تھی ۔ اور اس کی پشت پر اس کی مصنوعی کالی کالی گھنگریلی دراز زلفیں

ناگن کی طرح لہرا رہی تھیں۔ سامنے کے باکس میں ایک نوجوان بیٹھا ہوا بڑی دیر سے اس کو گھور گھور کے دیکھ رہا تھا۔ نوجوان بھی اس کی طرف کن انکھیوں اور ترچھی ترچھی نظروں سے دیکھنے لگا اور اس کی جسارت کو ہوا دینے لگا۔ تیسرے ایکٹ کے اختتام پر باکس بوائے نے اس کو ایک حسین پھولوں کا گچھا لا کر دیا۔ جس کے ساتھ ایک ملحق کارڈ پر لکھا تھا:۔

"بخدا تم دُنیا کی سب سے حسین عورت ہو۔ مجھ پر رحم کرو اور ایک مرتبہ مجھے اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ دو۔"

پولش نوجوان نے اس عاشق زار کا نام پڑھا۔ جو اتنی جلدی اس کے تیر نظر کا شکار ہو گیا تھا۔ زیر لب مسکراتا ہوا اپنے ملاقاتی کارڈ پر جس پر اس کا فرضی نام "ویلاسکا" لکھا ہوا تھا۔ مزید اتنا اور لکھ دیا۔ "تماشہ کے ختم ہونے کے بعد" اور نامہ بر کو دے دیا

تماشہ کے اختتام پر مصنوعی نازنین بھاری بھاری کپڑوں میں ملبوس، ہلکی سی نقاب ڈالے ہوئے اپنی گاڑی میں داخل ہونے لگی۔ تو وہی نوجوان ہیٹ اٹھائے ہوئے گاڑی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اور اس نے جھٹ بڑھ کر کوچ وانوں کی طرح گاڑی کے پٹ کھول دئے۔ پولش نوجوان نے ازراہ نوازش اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ دوران سفر میں وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آتا رہا۔ اور پیار و محبت کی باتیں کرتا رہا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی اس نے بڑی بے رخی سے نوجوان کو مایوس لوٹا دیا۔ وہ روزانہ تھیٹر جانے لگا۔ اور بلا ناغہ اس کو عشق و محبت کے پیغام آنے لگے۔ ہر رات وہ گاڑی میں اپنے عاشق کو اپنے ساتھ بٹھا لیتا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی اسے مایوس و ناکام لوٹا دیتا۔ پولش نوجوان کے دوسرے عاشق اس نوجوان

کو اپنی معشوقہ سے اتنا خلط ملط دیکھ کر رشک کی آگ میں جلنے لگے تھے۔ لیکن یکایک ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔

پولش نوجوان کے عشق میں جو نوجوان اس بری طرح گرفتار ہوا تھا وہ اتفاق سے خاتون محترم کا شوہر نامدار نکلا۔ جس کو پولش نوجوان سے پہلے سے کوئی تعارف نہ تھا۔ ایک روز جب پولش نوجوان اور خاتون محترم بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ ایک دوسرے کی آغوش میں محو بوس و کنار تھے کہ یکایک اتفاق سے خاتون محترم کا شوہر آدھمکا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں غصہ کے مارے لال پیلی ہوگئیں۔ اس نے بڑھ کر دیوار سے لٹکی ہوئی تلوار میان سے کھینچ لی اور نوجوان پولش کی طرف لپکا۔ خاتون محترم تو ادھ مری ہو کر صوفے پر گر پڑیں اور بے ہوش ہوگئیں۔ پولش نوجوان نے جلدی سے بڑھ کر میز پر بکھری ہوئی مصنوعی زلفوں کو اٹھا کر اپنے سر پر جمالیا۔ اور دوڑ کر اپنی ریشمی لبادہ اوڑھ لیا۔ جسے وہ پہن کر خاتون محترم کے محل میں داخل ہوا تھا۔

یہ روپ دیکھ کر شوہر ششدر رہ گیا اور حیرانی سے پوچھا۔

"کون ہو تم؟ ——— ویلا سکا؟

جی جناب! ——— میں ویلا سکا ہوں۔ اور میں یہاں اس لئے حاضر ہوا تھا۔ کہ آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ عاشقانہ خطوط آپ کی بیوی کو دکھلاؤں جو آپ نے ———"

"نو ——— نو ——— اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔ گھبرائی ہوئی اور شکست خوردہ آواز میں اس نے کہا ——— "کوئی ضرورت نہیں اس کی"۔ اور اس نے فوراً تلوار میان میں واپس رکھتے ہوئے کہا ——— "آؤ ہم تم صلح کرلیں!

"بہت اچھا" ——— پولش نوجوان نے اطمینان سے جواب دیا ———
"مگر تم کبھی یہ نہ بھولنا کہ میرے پاس تمہارے خلاف کتنا خطرناک ہتھیار ہے"

اس کے بعد دونوں حضرات نے ایک دوسرے کے سامنے مودبانہ گردن خم کرلی۔ اور یہ خلاف امید صحبت اختتام کو پہنچی۔

اس روز سے دونوں میاں بیوی کی زندگی میں بڑی سکون پیدا ہوگیا۔ خاتون محترم کو پھر اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کہ اپنے عاشق سے ملنے کے لئے اس کو لہنگا پہنا کر محل میں بلائیں۔ اس کے علاوہ شوہر اور پہلے کی مصنوعی "ویلاسکا" اور اب کے پولش نوجوان میں کافی بے تکلف دوستی ہوگئی اور وہ دونوں اکثر و بیشتر ساتھ ساتھ دکھائی دینے لگے۔

"مسیح یسوع"

"Wolf"

بھیڑیا

بیرن ذی راویل کے دولت خانہ پر سینٹ ہیبرٹ کے اعزاز میں منعقد ڈنر کے اختتام پر سن رسیدہ مارکوئس دلی آرویلا نے یہ کہانی ہم لوگوں کو سنائی۔

اس روز تمام دن بارہ سنگھے کا شکار ہوتا رہا تھا۔ اور صرف مارکوئس ہی نے اس شکار میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ کبھی بھی شکار نہیں کیا کرتا تھا۔

اس طویل عرصے میں سوائے جانوروں کے شکار اور ان کی غارت گری کے علاوہ اور کوئی موضوع سخن ہی نہ تھا۔ خواتین بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ ان غیر معمولی اور پر خطر واقعات کو سن رہی تھیں ——— اور قصے سنانے والے بلند آوازوں میں ہوا میں ہاتھ نچا نچا کر درندوں اور انسانوں کی مڈبھیڑ اور مقابلوں کا ذکر کر رہے تھے۔

مانفیشر دی آرویلا بڑا باتونی آدمی تھا۔ اس کی گفتگو میں کہیں تو شاعرانہ چاشنی کی حلاو ہوتی اور کہیں پر تھوڑی سی تشنیخی کا عنصر موجود ہوتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا طرز ادا کافی موثر کن بھی تھا ——— وہ اس قصہ کو پہلے بھی کئی بار سنا چکا تھا۔ تصورات کو لفظی

جامہ پہننے میں ذرا بھی دقت محسوس ہوئے بنا وہ اسی سرعت اور روانی کے ساتھ بغیر کہیں اٹکے ہوئے قصہ سنائے چلا جاتا تھا۔

حضرات! ——— میں کبھی شکار نہیں کھیلتا۔ اور نہ میرے والد ماجد نے کبھی شکار کیا۔ نہ میرے دادا مرحوم نے اور نہ پردادا مغفور نے ——— آخر الذکر ایک ایسے باپ کی اولاد تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگی میں آپ لوگوں سے کہیں زیادہ شکار کھیل رکھا تھا۔ مرحوم نے ۱۷۶۴ء میں اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ میں آپ حضرات کے سامنے بیان کرونگا۔ کہ کس طرح مرحوم کی موت واقع ہوئی۔ مرحوم کا نام نامی جان تھا اور بعد از ازدواج انہوں نے میرے پردادا کے دادا کے والد ہونے کی سعادت حاصل فرمائی۔ کورنش کے گھنے جنگلات میں واقع ایک قلعے میں مرحوم اپنے چھوٹے بھائی فرانسس دی۔ آرڈیلا کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

فرانسس دی۔ آرڈیلا شکار کے انتہائی دلدادہ اور شوقین تھے اور اسی شوق کے پیچھے عقل کے اعتبار سے ہمیشہ طفل مکتب ہی رہ گئے۔ یہ دونوں حضرات سال کے بارہ مہینے بلا کسی توقف اور بلا لحاظ موسم جنگلوں میں اِدھر سے اُدھر شکار فرمایا کرتے تھے۔ انہیں نہ تو کسی اور چیز کا شوق تھا۔ اور نہ کسی دوسرے شغل سے لگاؤ۔ سوائے شکار کے تذکرے کے کبھی بھی کوئی دوسرا موضوع گفتگو ہی نہیں رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے ساری زندگی اسی کار خیر کے لئے وقف کر دی ہو۔

سخت جانی اور دہشت انگیزی ان کی فطرت میں داخل ہو کر ان کے سارے خیالات اور احساسات پر مسلط ہو چکی تھی ——— اس حد تک کہ اب مزید خیالات کے لئے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ کوئی چیز بھی ان کے شغل شکار میں حائل نہ ہو سکے گی۔ میرے پردادا مرحوم اس وقت اس دنیا میں نازل ہوئے جس وقت ان کے والد بزرگوار جنگل میں ایک لومڑی کا تعاقب فرما رہے تھے ———

لیکن اس اطلاع کے باوجود قبلہ جان دی - آرویلا نے اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا - اور برابر لومڑی کا تعاقب فرماتے رہے ——— بلکہ یہ فرمایا کہ "فرزند ارجمند کو اس وقت پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ جب کہ ان کے کانوں میں لومڑی کی آخری ہچکی کی آواز پہنچ گئی ہوتی"۔ ان کے بھائی فرانسس صاحب تو ان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ صبح کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی آپ کا پہلا کام یہ ہوتا کہ آپ سیدھے اپنے شکاری کتوں کی خدمت میں حاضر ہوتے - اس کے بعد گھوڑوں کی خیر و عافیت پوچھی جاتی - دن میں درندوں کے شکار کے پروگرام کے باوجود ادھر ادھر ٹہنیوں پر بیٹھی ہوئی دو چار چڑیوں کو بھی بندوق کے چھروں پر ٹپکا لیا کرتے تھے۔

اس علاقے میں بڑے صاحب ہاینشر مارکوئس اور چھوٹے مارکوئس کارے کے نام سے مشہور تھے۔ پرانے زمانے کے امراء آج کل کے رؤسا کی طرح تھوڑے ہی تھے جو اپنے خطابات کے آگے اپنے بزرگوں کے خطابات کا بھی اضافہ کر لیتے ہیں۔ اس زمانے میں نہ تو کسی مارکوئس کا لڑکا کاونٹ کہلاتا تھا۔ اور نہ کسی کاونٹ کا فرزند بیرن کہلاتا تھا۔ آج کل تو جنرل کی اولاد پیدائشی کرنل کہلانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے۔ خودنمائی بھی آج کل جاہ و حشمت کی ایک خبر ہو گئی ہے ——— ہاں! تو میں اپنے اسلاف کا ذکر کر رہا تھا۔

وہ دونوں بھائی جسم کے لحاظ سے کافی لحیم شحیم واقع ہوئے تھے اور ان کے مزاجوں میں کافی سختی اور درشتی تھی۔ چھوٹے صاحب کا قد بڑے بھائی سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ روایت کے مطابق کچھ خدا کے فضل سے ایسی گرجدار آواز پائی تھی کہ جس وقت پکارتے تو جنگل کے قرب و جوار کے سارے درختوں کے پتے کھڑ کھڑ۔ کھڑ کھڑ ہلنے لگتے ——— اور جناب کو اپنی اس آواز پر کافی ناز بھی تھا۔

اونچے اونچے گلڑے قسم کے قد آور گھوڑوں پر سوار۔ پورے ساز و سامان سے لیس ——— ان لوگوں کو شکار پر روانہ ہوتے ہوئے دیکھنا کافی دلچسپ ہوتا ہوگا

"۱۷۶۴ء کے موسم سرما کے درمیانی ایام میں کافی سردی پڑنے لگی تھی - اور اطراف و اکناف کے بھیڑیے کافی خونخوار ہوگئے تھے - ان بھیڑیوں نے رات میں دیر سے گھر لوٹتے ہوئے دیہاتیوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے تھے - راتوں کو مکانوں کے گرد چکر لگانے رہتے تھے - سنجھیا سے لے کر سویرے تک خوف ناک آوازوں میں چلایا کرتے اور اصطبلوں کی دیواروں کو کریدنے لگے تھے -

ایک دن یہ .... افواہ اڑی کہ ایک بھورا سفیدی مائل بھیڑیا جو پہلے ہی دو معصوم بچوں کو کاٹ کھا چکا تھا - اور کئی دیہات کے کتوں کا گلا گھونٹ چکا تھا اور ایک عورت کا سوتے میں ہاتھ کتر چکا تھا - ادھر کچھ دنوں سے راتوں میں مکان کے احاطوں میں گھس آتا ہے - اور دروازے سونگھنے لگتا ہے - اکثر آدمیوں نے اس خبر کی تصدیق یوں کی کہ واقعی انہوں نے اس کی خطرناک سانسوں کی پھنکار دروازوں کے باہر سنی تھی - جس کی دہشت سے مکان کی بتیاں ٹمٹمانے لگتی تھیں - بڑی سرعت کے ساتھ ایک دہشت انگیز لہر سارے قرب و جوار میں دوڑ گئی - سورج غروب ہونے کے بعد کوئی بھی مکان کے باہر نکلنے کی ہمت نہ کرتا - راتوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ ہر ہر چھائیں کے پیچھے دبے دبے پاؤں کوئی بھیڑیا چلا آ رہا ہے -

دی آرونیلا برادرس نے یہ طے کر لیا کہ اس کا خاتمہ ضرور کرنا چاہیئے - اور اس مقصد کے لئے انہوں نے سارے اطراف و اکناف کے لوگوں کو اکٹھا کر کے بڑے پیمانہ پر ہاکے کی تیاری کی -

ساری محنت بیکار گئی - ان لوگوں نے جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا - ہر ایک جھاڑی میں تلاش کیا - لیکن کہیں بھیڑیے کا شائبہ تک نظر نہ آیا - انہوں نے اس ہاکے میں کئی بھیڑیے مارے لیکن باوجود انتہائی کوششوں کے وہ بھورا سفیدی مائل خطرناک بھیڑیا ہاتھ نہ لگا - روزانہ شام کو ہاکا ختم ہوتے ہی بھیڑیا شاید اس تعاقب کا بدلہ لینے کی خاطر راتوں کو پھر کسی مسافر پر حملہ کر بیٹھتا یا کسی جانور کی گردن کاٹ کھاتا - اور عموماً یہ حادثات ہاکا کے

مقامات سے بہت دُور فاصلے پر واقع ہوتے۔

آخر کار نوبت بہ ایں جا رسید کہ ایک رات وہ قلعہ آرویلا کے سور گھر میں گھس پڑا۔ اور سوروں کی ایک نایاب نسل کی نہایت ہی خوبصورت جوڑی کو پھاڑ کھایا۔

اس واقعہ سے وہ دونوں بھائی غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس بھیڑیئے نے ان کی ذاتی ہتک اور تذلیل کی ہے۔ اور ان کی بہادری کو چیلنج کیا ہے۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنے تمام بہترین شکاری کتوں کی فوج لے کر غصہ اور نفرت کے جذبات سے بھرے ہوئے اس درندے کا خاتمہ کرنے کے لیے نکل پڑے۔

سویرے سے لے کر اس وقت تک جب کہ سورج تاڑ کے جھاڑوں کے پیچھے غروب نہیں ہو گیا۔ وہ برابر جنگل کا کونہ کونہ چھانتے رہے۔ لیکن کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔

آخر کار غصہ میں بے دل اور مایوس ہو کر چلتے چلتے انہوں نے گھوڑوں کو ایک پگ ڈنڈی کی طرف موڑ دیا۔ جس کے دونوں طرف اونچی اونچی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ بھیڑیئے کے اس طرح روپوش ہونے پر بہت ہی اچنبا تھا ——— یکایک انہیں ایک خوف سا محسوس ہونے لگا۔

بڑے بھائی نے کہا۔

"یہ کوئی معمولی جانور معلوم نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی سمجھ آدمیوں کی طرح ہو۔"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔

"ممکن ہے کہ ایسا ہو ——— ہمیں اپنے چچازاد بھائی بشپ (BISHOP) کو بلا لینا چاہیئے۔ تاکہ وہ ہماری بندوق کی گولیوں پر کچھ دعا پڑھ کر پھونک دے یا پھر کسی پادری سے دعا کروائی جائے۔ کہ خدا ہماری مدد کرے۔

پھر وہ دونوں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد جان نے کہا ——— وہ دیکھو سورج کتنا سُرخ نظر آرہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج رات بھیڑیا پھر کوئی غارت گری مچائے گا...... ابھی ان کا جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ گھوڑا بڑے زور سے بھکا اور بڑی تیزی سے بھاگنے لگا۔ اسی وقت فرانسس کا گھوڑا بھی چمک کر بھاگنے لگا۔ سامنے سوکھے پتوں سے ڈھکی ہوئی ایک بڑی سی جھاڑی خود بخود اوپر کو اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی اور اس کے نیچے سے ایک بڑا سا بھورا سفیدی مائل درندا برآمد ہوکر سامنے کے جنگل میں غائب ہوگیا۔

دونوں شکاریوں نے پھرتی سے اپنے جسموں کو زین سے اٹھاکر اور آگے کی طرف جھک کر گھوڑے کی گردن سے چمٹ کر اور للکار للکار کر اور مہمیز مار مار کر شکار کے تعاقب میں انہیں دوڑانا شروع کردیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ چابکدست سوار اپنی دونوں رانوں کے بیچ گھوڑوں کے وزن کو اٹھائے ہوئے ہوا سے باتیں کررہے ہیں۔

درختوں کو چیرتے ہوئے۔ نالوں کو پھاندتے ہوئے۔ ڈھلوان چٹانوں کے کناروں سے گذرتے ہوئے اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے قریب کے لوگوں اور کتوں کو آگاہ کرنے کے لئے بگل بجاتے ہوئے وہ سرپٹ اڑے چلے جارہے تھے۔

لیکن اس خطرناک گھوڑ دوڑ کے دوران میں میرے بزرگ کی پیشانی اتفاقاً ایک مضبوط جھکی ہوئی شاخ سے ٹکرائی اور ان کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ بالکل بے حس بے جان مُردہ کی طرح لڑھک کر وہ گھوڑے سے نیچے آرہے۔ اور ان کا گھوڑا بدحواسی کے عالم میں جنگل میں گھس پڑا۔

"چھوٹے بھائی دی آر ویلا نے فوراً گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ اور نیچے کود پڑے۔ اپنے بھائی کو دونوں باہوں میں سنبھال لیا۔ اور یہ محسوس کیا کہ ان کے ہوش و حواس بالکل ختم ہوچکے ہیں۔

اپنے دونوں ہاتھوں میں بھائی کا ٹوٹا ہوا سر لے کر وہ وہیں بیٹھ گئے۔ اور حیرت سے

ان کا چہرہ تکنے لگے۔ رفتہ رفتہ ایک خوف ان کے دماغ میں چھانے لگا۔ ایک ایسا خوف جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ پرچھائیوں کا خوف۔ اکیلے ہونے کا ڈر۔ جنگل کی وحشت اور اس ہیبت ناک بھیڑیئے کا ڈر، جو ان کے بھائی کی موت کا باعث ہوا۔ سائے گہرے ہونے لگے اور درختوں کی شاخیں سردی کی وجہ سے کھڑکھڑانے لگیں۔

فرانسس کانپتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ اب وہاں کچھ دیر اور نہیں ٹھہر سکتے۔ اور ان کی ہمت جواب دیتی جا رہی ہے۔ فضا بالکل خاموش اور سنسان تھی۔ نہ تو بگل کی آواز تھی اور نہ کتوں کی۔ اُفق تک سارا ماحول بالکل ساکت اور جامد تھا۔ اور اس اداس خاموش شام کی خنکی میں ایک عجیب و غریب خوف کی ملاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔

فرانسس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے جان کی لاش کو اٹھا کر گھوڑے کی زین کے سامنے لاد لیا۔ تاکہ اسے گھر لے جا سکیں۔ پھر وہ خود احتیاط سے لاش کے پیچھے زین پر سوار ہو گئے .... اور اس وقت ان کے دماغ پر ڈراؤنے قسم کے غیبی تصوّرات چھائے چلے جا رہے تھے۔

یکایک ان وحشت زدہ تصوّرات کے درمیان سامنے ایک دھندلی سی شکل دکھائی پڑی ——— اسی بھیڑیئے کی یہ دیکھ کر ان کے تمام جسم میں غصّہ اور نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے تمام رگوں میں برف سی پگھلی جا رہی ہو۔ ان کی انگلیاں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور انہوں نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا ——— بالکل اس طرح جیسے ایک عابد بد ارواح سے محفوظ رہنے کے لئے بناتا ہو۔

بھیڑیئے کے دوبارہ نمودار ہونے کے خوف سے ان کا دل دہل سا گیا۔ اتنے میں پھر ان کی نظر سامنے لدی ہوئی بھائی کی لاش پر پڑی ۔ اور فوراً ان کی دہشت تبدیل ہو کر غصہ کا

رنگ اختیار کرنے لگی - اور وہ مارے غصہ کے تھرتھرانے لگے۔
انہوں نے گھوڑے کو مہمیز لگائی - اور پھنکے ہوئے نیزے کی طرح تیزی سے اس کا پیچھا کرنے لگے۔
جھاڑیوں میں غاروں میں گھنے اور انجان جنگلوں میں وہ برابر اس کا پیچھا کرتے رہے ان کی آنکھیں برابر اس سفید متحرک نقطے پر گڑی ہوئی تھیں - جو سامنے کی طرف اڑتا ہی چلا جا رہا تھا - بالکل اس طرح جیسے رات زمین پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔
گھوڑا ابھی کسی غیبی طاقت کی امداد سے متحرک معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے درختوں اور چٹانوں پر سے اچکتا اور جھاڑیوں کو چیرتا ہوا زمین پر لٹکی ہوئی لاش کو سنبھالے وہ گردن کو آگے کی طرف نکالے ہوئے بھاگا چلا جا رہا تھا - اس کے ایال بار بار پرخار جھاڑیوں میں الجھ جاتے تھے - درختوں کے تنوں سے ٹکرانے کی وجہ سے اس کے سر سے خون کی دھاریں ٹپک رہی تھیں - اور اس کی ران کے دونوں طرف مہمیز کے گہرے نشان کافی نمایاں دکھائی پڑ رہے تھے۔
دفعتاً گھوڑا اور سوار جنگل سے باہر نکل آئے - اور ایک وادی میں داخل ہو گئے۔
اس وقت چاند پہاڑ کی چوٹیوں سے اوپر چڑھ چکا تھا - یہ پتھریلی وادی آگے جا کر بڑی بڑی چٹانوں سے گھر سی گئی تھی - اور یہاں سے گذرنا کافی وقت طلب تھا - ایسے حالات میں سوائے لوٹ پڑنے کے بھیڑیے کے لئے اور کوئی راستہ نہ تھا۔
یہ دیکھ کر فرانسس جوشِ انتقام کی مسرت سے اس زور سے چیخ اٹھا - جیسے بادل گرج رہے ہوں - وہ تلوار سونتے ہوئے گھوڑے سے کود پڑا - درندہ اپنے رونگٹے کھڑے ہوئے ان پر جھپٹ پڑنے کے لئے تیار کھڑا تھا - اور اس کی آنکھیں رات کی تاریکی میں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں - لیکن اس جنگ کی ابتدا کے پہلے دلیر شکاری نے اپنے بھائی کی لاش کو اتار کر ایک چٹان پر لٹا دیا اور اس کے خون سے لتھڑے ہوئے سر کو ایک پتھر کے

سہارے ٹکا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے بڑے زور سے چلا کر کہا ——— آنکھیں کھولو جان! ——— دیکھو ——— یہاں پر دیکھو" اتنی بلند آواز میں جیسے وہ ایک بہرے آدمی کو سنانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

اس کے بعد وہ دیو نما درندے پر جھپٹ پڑے۔ اپنے آپ میں انہیں اس وقت پہاڑوں کو اکھاڑ پھینکنے اور چٹانوں کو ہاتھ میں مسل ڈالنے کی قوت محسوس ہو رہی تھی۔ درندا اس داؤ میں تھا کہ اپنے ناخونی پنجوں کو ان کی رگوں میں پیوست کر کے ان کا خاتمہ کر دے۔

لیکن بغیر کسی ہتھیار کے استعمال کے شکاری نے اپنے دونوں ہاتھوں سے .... اس کا ٹینٹوا دبا لیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے گلے کی رگوں کو مروڑنے لگا۔ تاکہ اس کی سانس اکھڑ جائے۔ اور دل کی آخری دھڑکن وہ اپنے کانوں سے سن سکے

جوش مسرت سے ہولناک قہقہہ لگاتے ہوئے شکاری نے اپنی گرفت اور بھی تنگ کرنی شروع کر دی۔ اور زور زور سے اپنے مردہ بھائی کی لاش کو پکار پکار کر بڑبڑانے لگا ———

"دیکھو جان! ——— دیکھو!"

تھوڑی دیر میں ساری کشمکش ختم ہو گئی اور بھیڑیئے کا بدن ڈھیلا پڑ گیا اور اس کا دم نکل گیا۔ تب فرانسس نے ملتجیانہ آواز میں یہ کہتے ہوئے کہ "یہی ہے وہ بھیڑیا ——— میرے بھائی! یہی ہے وہ .... بھیڑیئے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر مرحوم بھائی کے پیروں پر ڈال دیا۔

اس کے بعد انہوں نے دونوں لاشوں کو آگے پیچھے زین پر لاد لیا۔ اور واپس روانہ ہو پڑے۔

کبھی روتے کبھی قہقہے لگاتے مسرت و غم کے ملے جلے احساس میں لپٹے ہوئے وہ محل واپس آئے ... وہ بھیڑیئے کی موت پر خوشی سے جھوم جھوم کر اپنی فتح کا اعلان کرتے جا رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے بھائی کا نام لے کر رنج اور افسوس سے اپنی داڑھی

نوچنے لگے۔

.......اور وہ اپنی زندگی کے باقی ایام میں جب کبھی انہیں اس واقعے کی یاد آتی ۔ تو وہ بڑی حسرت سے کہتے ——— کاش کہ بھائی صاحب نے مجھے بھیڑیئے کا ٹینٹوا دباتے ہوئے دیکھ لیا ہوتا ۔ مجھے یقین ہے کہ کافی سکون کے ساتھ ان کی رُوح پرواز کرتی ۔

"توحضرات ...... میرے بزرگ مرحوم کی بیوہ مغفورہ نے بھی اپنے فرزند میں وہی ہمت اور دلیری کی روح پھُونک دی ۔ جو نسلاً بعد نسلاً باپ بیٹوں سے ہوتی ہوئی مجھ کو نصیب ہوئی ہے"!

یہ کہہ کر مارکوئس دی آروبلا خاموش ہوگیا ۔ کچھ دیر بعد کسی نے پوچھا

"یہ کہانی ہے کہ کوئی سچا واقعہ ———"؟

"قسم خدا کی ——— اس واقعہ کا ایک ایک لفظ صحیح ہے" ——— قصہ گو نے جواب دیا ۔

ایک خاتون نے اپنی ننھی سی سُریلی آواز میں کہا

"لائق تحسین ہے یہ جوش و خروش بھی"

Merd-e- Medan

مردِ میدان

"پیار ——— محبت"۔ پیری نے کاندھے جھٹکارتے ہوئے اپنے دوستوں سے کہا ——— "کون کہتا ہے کہ دنیا میں پریم نہیں ہے؟ پیار تو بہت ہے لیکن پیار کرنے والے نہیں رہ گئے ہیں۔ محبت کی پینگیں بڑھانے والے اور عشق کے مردِ میدان ختم ہوگئے ہیں۔ ورنہ اوسان نواب بھی گلی گلی۔ کوچہ کوچہ میں بکھرا پڑا ہے۔ عشق کے اکھاڑے میں کودنے کے لئے ذرا ہمت درکار ہے۔ آجکل کے عاشقوں کی ہمتوں کو تو زنگ لگ گیا ہے۔ میدانِ عشق کے خطرات مول لینے سے ڈرتے ہیں۔ بس ذرا کہیں کسی خطرہ کا سامنا کرنا پڑا کہ سارا عشق رفو چکر۔ حضرت عاشق سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اگر آدمی آنکھیں بند کر کے ذرا ہمت اور دل سے کام لے۔ تو آج بھی من چلوں کے لئے عشق کے دروازے وا ہیں ——— میں کبھی عشق کے دھندوں میں نہیں پڑتا لیکن ایک بار تو میں نے بھی ہمت کر ہی ڈالی۔ واقعہ یوں ہوا کہ:۔

ایک مرتبہ مجھے فلورنیس جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پر میں بڑی خاموش اور گمنام

زندگی بسر کر رہا تھا۔ بغیر کسی رومانی حادثات سے دوچار ہوئے اگر مجھے اس شہر کے عیش پسند ماحول کا کچھ علم یا تجربہ تھا۔ تو بس صرف اتنا کہ کبھی کبھار راتوں کو چند بزرگ صورت شریف النفس انسانوں نما دلالوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ جو بڑی چالاکی سے دبے دبے لفظوں میں اجنبیوں کو پھانس کر اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتے تھے۔ یہ بزرگ نما انسان اجنبیوں کو گانٹھ کر اپنے گھر کی چار دیواریوں میں لے جاتے تھے۔ جہاں بڑے پرسکون خانگی ماحول میں ان کے گھر کی عورتیں اپنے بزرگ خاندان کی ادارت اور صدارت میں بڑے مزے سے مستقل پیشہ کیا کرتی تھیں۔ اس قسم کی عیاشی میں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ایسے پرسکون اور اطمینان بخش ماحول میں خطرات سے دوچار ہونے کا کوئی امکان نہ ہوتا تھا۔

ایک دن جب میں سرِ راہ کھڑا ہوا ——— کی خوبصورتیوں کو دیکھنے میں منہمک تھا کہ پیچھے سے کسی نے میری آستین پکڑ کر جھٹک دیا۔ گھوم کر میں نے دیکھا تو ایک عورت جس کی عمر لگ بھگ ۵۰ سال کی تھی قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”کیوں جناب! آپ فرانس کے رہنے والے ہیں؟“

”جی ہاں ——— میں فرانسیسی ہوں!“ میں نے جواب دیا۔

”کیا آپ نہایت ہی حسین و جمیل خاتون سے ملاقات کرنا پسند کریں گے؟“

”کیوں نہیں! ——— ضرور ——— !! بڑی خوشی سے!“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

یہ انوکھی قسم کی دعوت جس سنجیدگی اور اطمینان سے اس بڑھیا نے مجھے پیش کی تھی۔ اس میں ایک خاص قسم کا بھولاپن بھی شامل تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ذرا غور تو فرمائیے۔ یہ دعوتِ عشق۔ وہ بھی شاہراہِ عام پر۔ اور ٹھیک دن کی روشنی میں۔ وہ مجھ سے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی زبان میں بات کر رہی تھی۔ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے اور ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی کو اور بھی چکنا چور کرتے ہوئے اس نے کہا ”تم ایسی

حرکتیں تو نہیں کرتے ہو۔ جو عام طور سے فرانس میں کی جاتی ہیں؟
"کیسی حرکتیں ——؟" میں نے ذرا گھبرا کر کہا —— "وہ کونسی حرکتیں ہیں جو صرف فرانس ہی میں کی جاتی ہیں۔ دوسری جگہوں پر نہیں؟"
بہر حال جب بڑی دقتوں کے بعد وہ اپنا مطلب سمجھا پائی۔ تو اس شاطرہ کو تو کوئی حجاب محسوس نہ ہوا۔ لیکن مجھ کو شرم آ گئی۔ اور میں نے دبے ہوئے الفاظ میں اسے یقین دلایا کہ میں ان فرانسیسیوں میں سے نہیں ہوں۔ شرم کی لہر میرے چہرے سے غائب ہو گئی۔ اور میں بالکل پیلا پڑ گیا۔ جب اس بڑھیا نے مجھ سے یہ کہا
"اس کی تسلی کرنے کے لئے مجھے پہلے ذاتی طور پر خود تمہاری آزمائش کرنی پڑے گی"۔
اور یہ سب کچھ اس نے ایسے خود اعتمادانہ انداز میں کہا۔ کہ بجائے ہنسی آنے کے میرا چہرا فق ہو گیا۔
"تو کیا ——!" میں نے کہا —— "پہلے مجھے تم سے .... میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا"۔
پہلے تو یہ عجیب و غریب باتیں سن کر مجھے تعجب ہی تھا۔ لیکن جب اس نے بات خدا واضح کی۔ تو میں بالکل دیوانہ ہو گیا۔ یہ تو سچ مچ بڑا انوکھا واقعہ نکلا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے کان مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ بہر حال اس نے مجھے وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا:-
کہ وہ اس شہر کے ایک بہت مشہور و معروف اعلےٰ خاندان کی نہایت اونچی سوسایٹی کی ایک جرمن خاتون کی خاص الخاص کنیز تھی۔ اس کی بیگم کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی اعلیٰ طبقہ کے نہایت بامذاق فرانسیسی کے ساتھ کچھ گھڑیاں خاص الخاص صحبت میں بسر کرے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے موقعہ پر وہ فرانسیسی جرمنی کے اعلےٰ و شریفانہ طریقہ رواج کا خاص خیال رکھے۔ اور اعلےٰ مذاق کا ثبوت دے اور عام فرانسیسی کے طریقہ رواج سے

انحراف کرے۔ چنانچہ اس اعزاز کے لئے مجھ ناچیز کو یہ عزّت بخشی گئی تھی۔ لیکن اس ملاقات کی سب سے پہلی شرط یہ تھی۔ کہ مجھے سب سے پہلے اس بڑھیا کے سامنے اپنے اعلےٰ مذاق ہونے کا ثبوت دینا پڑے گا۔ اور اپنی کامیابی کا ثبوت پیش کرنا پڑے گا۔

"یا خدا!" ——— میں نے اپنے دل میں کہا ——— "یہ جرمن شاطہ اتنی بے وقوف نہیں ہے جتنی کہ دیکھنے میں آتی ہے"۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ اور وہ مجھے ہر طرح سے اکسا اکسا کر۔ گھبر گھبار کر اپنے بس میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میری بیگم نہایت خوبصورت اور حسین ہے۔ خوابوں کی ملکہ ہے۔ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہے۔ موسم بہار کی طرح رنگین ہے۔ پھول کی طرح خوش نما"۔

"لیکن گستاخی معاف ——— ! تم تو اپنی ملکہ کی طرح موسم بہار کا خوشنما پھول تو نہیں ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ شاید میں تمہیں اتنا مطمئن نہ کر سکوں۔ جتنا تمہاری حسین و جمیل بیگم کو"۔

یہ سن کر وہ اچک گئی۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولی ——— نہیں نہیں! وہ تمہاری طبیعت کھٹی کرنا نہیں چاہتی۔ صرف تمہاری آزمائش کروانا چاہتی ہے۔ پھر اس نے اپنی شستہ گفتگو کو وضاحت کر کے صاف اور عیاں کر دیا۔ یہ طے پایا۔ کہ وہ مجھے مائی پتیا کے مشہور چکلے میں لے جائے گی۔ جہاں میں تو وہاں کی کسی جوان اور خوبصورت لونڈیا سے محوِ عیش و نشاط ہو جاؤنگا۔ اور اس صحبت کے درمیان وہ بڑھیا ذاتی طور پر وہاں موجود رہے گی۔ اور میرے اعلےٰ مذاق کا امتحان لیتی رہے گی۔

"اوہو!" ——— میں نے اپنے دل میں کہا ——— "میں نے بڑھیا کا غلط اندازہ لگایا۔ دیکھنے میں تو وہ بالکل بے وقوف نظر آتی ہے۔ لیکن ہے بڑی ماہر فن۔ یہ تو اپنی قسم کی پہلی عورت نکلی"۔

"تو دوستو! آپ لوگ اگر اجازت دیں۔ تو میں شرم کے مارے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپاؤں۔ میں اتنا مورد الزام نہیں ہوں جتنا کہ آپ مجھے سمجھیں۔ میرا قصور صرف اتنا ہی تھا۔ کہ میں اس وقت جوانی کے نشے میں چور تھا۔ اور مائی پیتیتا کا عیش کدہ ایک نہایت ہی مشہور و معروف مقام عیش و عشرت تھا۔ لیکن مجھ جیسے غریب آدمی کے لئے وہاں تک رسائی ناممکن تھی۔ میں وہاں جانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہاں کا عام ریٹ پانچسو پونڈس تھا۔ میں بھلا اپنی جیب سے اتنی کثیر رقم کیسے خرچ کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بڑھیا کی پھوکٹ کی دعوت فوراً قبول کر لی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے اچھا کیا یا برا کیا۔ بہر حال میں نے کہا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی۔ کہ وہ بڑھیا جرمن نسل کی تھی۔ ہم فرانسیسیوں نے ان جرمنوں کو لاکھوں روپیہ بطور تاوان دوران جنگ میں دیا ہے۔ کم سے کم میں نے اتنا تو کیا کہ اس کثیر تاوان کی رقم میں سے زیادہ نہیں تو تھوڑی سی ہی رقم ایک جرمن کی جیب سے واپس وصول تو کر لی!

اچھا۔ تو مائی پیتیتا کی رنڈی بڑی رنگیلی نکلی۔ بڑھیا نے بھی اپنی صدارت کے دوران میں زیادہ روک ٹوک نہیں کی۔ اور میں اس امتحان میں پورا اترا۔ اور میں نے اپنے بامذاق ہونے کا ثبوت دے دیا۔ خدا کے فضل و کرم سے اس ناچیز نے دشمنوں کی سرزمین پر فرانس کی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

ایک روز بعد میں میں ——— کے اسٹیمو کے پاس کھڑا ہوا انتظار کر رہا تھا۔ میں اپنی جرأت ناشائستہ پر نادم ہوا لیکن حق تو یہ ہے کہ مجھے عارضی، عادۃ معشوق زنا شوی میں بڑا لطف آیا۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ ہم فرانسیسی غیر جگہوں پر جا کر اتنے لچر اور بیہودہ ہو جاتے ہیں۔

وقت مقررہ پر بڑھیا آئی۔ کافی اندھیرا چھا چکا تھا۔ چپکے سے میں اس کے پیچھے ہو لیا۔

بہر حال اس وقت میرا دل میری حرکتوں پر ملامت کر رہا تھا ۔ راستہ میں مجھے وہ پرسوں رات والی مائی پتیتا کے عشق کدہ کی لونڈیا بار بار یاد آ رہی تھی اور میں اسی کے خیال میں مگن چلا جا رہا تھا ۔ مجھے بالکل احساس نہ تھا کہ میں آخر کہاں جا رہا ہوں ۔ میں اپنے خواب سے اس وقت چونکا ۔ جب بڑھیا نے مجھ سے کہا —— لو ۔ ہم پہنچ گئے ۔ میرے اچھے نوجوان! ذرا خیال رکھنا ۔ اپنی خدمات ذمہ دارانہ طریقہ سے ادا کرنا ۔ اور نہایت بامذاق ہونے کا ثبوت دینا ۔ جیسا کہ تم نے پرسوں کی رات دیا تھا ۔

ہم اس وقت مائی پتیتا کے عشق کدہ کے دروازے پر نہیں کھڑے تھے ۔ بلکہ ایک تنگ گلی میں اونچی اونچی دیواروں والی محلسرا کے ایک چھوٹے سے پس پشت دروازہ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے ۔ بڑھیا نے بڑھ کر آہستہ سے دروازہ کھولدیا ۔

میرا دل چاہا ۔ کہ میں فوراً وہاں سے بھاگ جاؤں ۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا ۔ کہ یہ بڑھیا مجھے پھانس کر یہاں لائی ہے ۔ اور میرے محدود اور حقیر تجربات سے خود فائدہ اٹھانا چاہتی ہے ۔ اور میں اس سے اپنی جان بچانا چاہتا تھا ۔

"اندر آجاؤ ۔ اندر چلے جاؤ" —— اس نے کہا —— "ڈرتے کیوں ہو؟ جھجک کس بات کی؟ میری بیگم بہت خوبصورت ہیں ۔ اس رات والی چھوکری سے ہزار گنا حسین"

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں ۔ میری نظروں کے سامنے "الف لیلیٰ" کی جادو بھری کہانیاں حقیقت کا روپ اختیار کرتی چلی جا رہی تھیں ۔ میں نے سوچا کہ ڈر کس بات کا؟ یہ نرم و نازک دوشیزہ بھلا مجھے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے ۔ پھر میں ڈرتے ڈرتے اس کے قریب چلا گیا ۔

دوستو! اف کتنے رنگین لمحات تھے وہ! ایک گھنٹہ تک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں آسمان کی پری کے ساتھ تخت طاؤس پر بیٹھا اوج ثریا کی سیر کر رہا ہوں ۔

اپنے تاثرات کو لفظی جامہ پہنانے سے قاصر ہوں۔ محل کے عیش بلند پس منظر میں وہ دوشیزہ پرِیل کے دیس کی شہزادی دکھائی دے رہی تھی۔ کتنی چھیل چھبیلی جرمن عورت تھی وہ۔ کوشش کرنے پر ایک جرمن عورت بھی کتنی رنگین ہو سکتی ہے۔ اُف اس چل پری کے بال مریم کے بالوں کی طرح سنہرے تھے۔ آنکھیں نہایت مست اور جسم تو بالکل مکھن تھا۔

کچھ عرصہ بعد یکایک مہری چل پری تڑپ کر بستر سے علیحدہ ہو گئی۔ اور کود کر دور جا کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور غصہ کے انگارے برسنے لگے۔ پھر وہ کپڑے تبدیل کرنے والے پردے کی آڑ میں چلی گئی۔ اور جرمن زبان میں زور زور سے مجھے گالیاں دینے لگی۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ اسی وقت بڑھیا دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں مجھ سے بولی ——— جلدی کرو۔ جلدی سے کپڑے پہن لو۔ اور یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ ورنہ تمہاری گردن اڑا دی جائے گی۔

میں نے زیادہ سوال جواب کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے علاوہ وہ بڑھیا خود اتنی گھبرا گئی تھی کہ اس کو مجھے سمجھانے کے لئے فرانسیسی الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اور گھبراہٹ میں پاگلوں کی طرح بڑبڑا رہی تھی۔ میں نے موقعہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے جھٹ سے کپڑے پہنے اور جوتا بغل میں دبا کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا سرپٹ گلی میں بھاگ نکلا۔

دس منٹ دوڑنے کے بعد مجھے .... ہوش آیا۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس دوڑ دھوپ میں میں کتنی گلیاں پار کر آیا ہوں۔ بڑی دقتوں سے راستہ تلاش کرتا ہوا اپنے ہوٹل میں پہنچا۔ اور چوروں کی طرح چھپتا چھپاتا اپنے کمرہ میں داخل ہو گیا۔

"دوسرے دن صبح کو کیفے میں ہر طرف ایک قتل کی واردات کے چرچے ہو رہے تھے۔ ایک جرمن نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ لیکن اس کا بیان لینے کے بعد پولیس نے اس کو ضمانت پر رہا کر دیا تھا۔ اپنے بیان میں اس نے کہا تھا کہ (جس کی تصدیق اس کی بیگم کی خاص الخاص کنیز نے کی تھی) اس خاتون کی شادی اپنے شوہر سے زبردستی کر دی گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے سخت نفرت کرتی تھی (اس نفرت کی وجوہات کو صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا) اپنے شوہر سے بدلہ لینے کے لئے اس نے یہ کیا کہ رات میں چار غنڈوں کی مدد سے اس کو بندھوا کر خوب پٹوایا (اس بیان کی تائید ان غنڈوں نے کی تھی) اور اس کے بعد شوہر جب زنجیروں میں جکڑا مقید کھڑا تھا۔ تو شوہر کے حق زوجیت کو ٹھیس لگانے کی غرض سے اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی بیوی نے ایک فرانسیسی شخص کے ساتھ زنا کیا۔ اور اپنے مادر وطن کی توہین و ہتک ایک فرانسیسی کے ہاتھوں کروائی۔ جونہی اس جرمن شوہر کو قید سے نجات ملی۔ اس نے فوراً اپنی بے وفا اور وطن فروش بیوی کو بطور سزا کے گولی کا نشانہ بنا دیا۔"

"اور پھر تم نے کیا کیا؟" ——— حاضرین میں سے ایک شخص نے پیری سے دریافت کیا۔

"میں بھلا کیا کر سکتا تھا۔ ——— ؟" اس نے جواب دیا۔ "مجھے آخرکار اس کا مقابلہ کرنے پر تیار ہونا پڑا۔ ہم دونوں میں شمشیر زنی کی ٹھن گئی۔ اسکا حق تھا کہ مجھ سے بدلہ لے بہرحال جب شمشیر زنی شروع ہوئی تو دوران جنگ میں ایک بار اسکی تلوار نہایت خوفناک طریقہ سے میرا جسم چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ یہ بھی اس کے لئے جائز و واجب تھا کہ مجھ کو مار ڈالے۔ یہاں تک تو اس کا حق تھا۔ لیکن جب اس نے کہا۔ کہ "آؤ میری بیوی کے معشوق" تو پھر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے جوش میں نعرہ لگایا۔ "فرانسیسی۔ فرانسیسی۔ فرانس زندہ باد!" اور تلوار سونت کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

Men and Eggs

آدمی اور انڈے

(۱)

دس میل کے قرب و جوار میں کوئی ایسا نہ تھا جو توآں مٹکے کو نہ جانتا ہو۔ وہ موضع تورو واں کا چھوٹا موٹا زمیندار بھی تھا۔ لوگ اسے پیار سے "مائی نائیو توآں" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

سمندر کے کنارے اور کوہ وادیوں کے کونے میں بسے ہوئے اس نامعلوم گاؤں کو توآں کی ذات بہ صفات نے مشہور کر رکھا تھا۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں مشکل سے ایک درجن نارمنوں کے گھر آباد تھے۔ جن کا پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ چاروں طرف سے یہ گاؤں کھڈوں اور درختوں کے جھنڈ سے گھرا ہوا تھا۔ پہاڑ کے نکڑ پر جھاڑیوں سے گھری ہوئی اس وادی میں مکانات ایک دوسرے سے کھنچ کھینچ ملے ہوئے تھے۔ اور اسی وجہ سے اس گاؤں کا نام ٹاڈنے وانٹ پڑ گیا تھا۔ سمندر کی نمکین ہوا سے محفوظ رہنے کے لئے جو بعض اوقات شعلوں کی طرح ساحل کی طرف سے لپکتی تھی۔ چڑیوں نے اس وادی میں اپنے

آشیانے بنا رکھے تھے۔

سارے گاؤں میں تو آں مشہور اور ہر دلعزیز تھا۔ لوگ اسے پیار سے "مائی فائن تو آں" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اس محاورے کی تاویل میں وہ یوں کرتا تھا کہ فرانس کی سب سے بہتر شراب "مائی فائن" لیبل کی شراب ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کے مئے خانہ کی شراب بھی اس کے مماثل تھی۔ متواتر عرصہ ۲۰ سال سے وہ اس گاؤں کی سرزمین کو شراب سے سیراب کر رہا تھا۔ اپنے گاہکوں کو شراب کا پیالہ پیش کرتے وقت وہ برابر کہا کرتا تھا "یہ وہ چیز ہے جو تمہارے پیٹ میں ٹھنڈک پیدا کرتی ہے۔ اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔ دنیا میں صحت کے لیے اس سے کوئی اور چیز بہتر نہیں ہے ——— بیٹا!" وہ ہر شخص کو "بیٹا" کہا کرتا تھا۔ حالانکہ اس کے خود کے کوئی اولاد نہ تھی۔

بہرحال کوئی ایسا نہ تھا۔ جو تو آں کو جانتا نہ ہو۔ وہ نہ صرف اس گاؤں کا سب سے مشہور و معروف آدمی تھا۔ بلکہ اس کی شہرت سارے ضلع میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا مکان نہایت ہی پست تھا۔ اور اس کے حلیہ کے اعتبار سے بالکل ناموزوں دکھائی دیتا تھا۔ خاص کر جب وہ اپنے دروازے کے سامنے جہاں وہ دن کا زیادہ تر وقت گذارا کرتا تھا۔ کھڑا ہو جاتا تو یقین نہ ہوتا کہ یہ موٹی لاش اس تنگ اور پست دروازہ میں داخل بھی ہو جائے گی یا نہیں۔ لیکن گاہک کی آمد پر وہ بڑی پھرتی سے اس میں گھس پڑتا تھا۔ کیونکہ جو گاہک بھی اس کے ہاں شراب پینے آتا۔ تو آں بھی پینے میں اس طرح اس کا شریک ہو جاتا جیسے یہ اس کا پیدائشی حق ہو۔

اس کے کیفے پر بڑے سے بورڈ پر لکھا ہوا تھا

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ وہ اس علاقے کے ہر شخص کا دوست تھا۔ بڑی بڑی دور سے لوگ اس سے لطف اٹھانے اور اس کے قصے سننے کے لیے آتے تھے۔ اس کی باتوں میں اتنی ظرافت ہوتی تھی کہ شاید اگر مردے بھی سن پاتے تو قبر میں ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو

جاتے۔ اس کے مذاق کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بھی اس کے مذاق کو بُرا نہ مانتا تھا جس چیز کو وہ زبان سے کہنا نہ چاہتا تھا۔ اس کو عجب طرح سے آنکھیں مٹکا مٹکا کر اس کا اظہار کر دیتا تھا۔ باتیں کرتے کرتے کسی کی پسلیوں میں گھونسہ مار دیتا تھا کہ اگر اس کو ہنسی نہ بھی آتی ہو تو آ جائے۔ اس کی شراب نوشی کا منظر بڑا ہی پُر لطف ہوتا تھا۔ جتنا بھی اس کو پینے کے لئے پیش کیا جاتا وہ بلا عذر پی جاتا تھا۔ پیتے میں اس کی چالاک آنکھوں سے دو طرح کی مسرت ٹپکتی تھی۔ ایک تو بے خودی کی مسرت اور دوسرے اس بات کی خوشی کہ "مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے"۔ دام تو اس کے گاہک کی جیب سے جائیں گے۔ بعض مسخرے خواہ مخواہ کے اس فکر میں دُبلے ہوئے جا رہے تھے۔ کہ آخر تو آں کی بیوی ایک آدھ بچہ کیوں نہیں جن رہی ہے؟ آخر ایک روز لوگوں نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس نے آنکھ مارتے ہوئے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے کہ نہلے پر دہلا ٹھیک طرح چپک نہیں پا رہا ہے"!

تو آں اور اس کی بیوی کے گھریلو جھگڑوں سے پینے والے گاہک اتنا ہی لطف اٹھاتے تھے۔ جتنا کہ انہیں جام شراب سے حاصل ہوتا تھا۔ وہ دونوں اپنی ازدواجی زندگی کے ۳۰ سالہ عرصہ میں برابر لڑتے جھگڑتے رہے تھے۔ ٹونی مزاج کا سیدھا تھا۔ لیکن اس کی بیوی بڑی لڑاکا تھی۔ وہ لمبی تڑنگی اکھڑ قسم کی دیہاتن تھی۔ اس کا جسم چھریرا تھا اور شکل بالکل اُلّو کی سی تھی۔ مکان کے پچھلے حصّے کے چھوٹے سے صحن میں اس نے ایک مرغی خانہ بنا رکھا تھا۔ اور انہیں کی داشت میں دن رات مصروف رہتی تھی۔ اس کی مُرغیاں مارے موٹاپے کے دوہری ہوئی جاتی تھیں۔

جب کبھی بھی کسی معزز گھرانے میں کوئی دعوت مدارات ہوتی۔ تو مادام تو آں کے مرغی خانے کی مُرغیاں ضرور زیب دستر خواں ہوتیں۔

مگر وہ طبیعت کی بڑی چڑچڑی واقع ہوئی تھی۔ اور ہمیشہ بیزار سی رہتی تھی۔ اس

کی گاؤں میں کسی سے نہ پٹتی تھی۔ اور اپنے شوہر سے تو وہ ہمیشہ بگڑی ہی رہتی تھی۔
وہ اپنے شوہر سے بڑی ترش روئی سے پیش آتی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا۔ کہ
توآں نکموں کی طرح بغیر محنت مشقت کے بیٹھے بٹھائے کمائی کھاتا تھا اور وقت واحد میں
دس آدمیوں اتنی خوراک اور شراب بغیر ڈکار لئے ہضم کر جاتا تھا۔ بلاناغہ وہ طعنے دیا
کرتی تھی کہ اس کا صحیح مصرف بس یہی ہے کہ اس کو اصطبل میں سوروں کے ساتھ باندھ
دیا جائے۔ اِس لئے کہ اس کی شکل بالکل سوروں کی سی تھی۔ وہ اُسے چربی کا تھیلا کہا کرتی
تھی۔ اس کے منہ پر چھینٹے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے وہ کہتی :-

"تھوڑے دن اور ٹھیرو! دیکھو کیا ہونے والا ہے۔ یہ موٹا اس طرح پھٹے گا۔
جس طرح ہوا کا غبارہ پھٹتا ہے"

توآں ہنستے ہوئے اپنی ڈھول کی سی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیتا "میری
پیاری مرغی ——— ! ہمیں نظر کیوں لگاتی ہو تم اپنے چوزوں کو ہماری طرح موٹا
کرلو۔ تو جانیں!"

اور اپنی آستین چڑھا کر دبیز دار باہیں دکھاتے ہوئے کہتا ——— "دیکھو
ان بازوؤں پر پرانگ رہے ہیں" گاہک یہ سن کر ہنسی کے مارے میز پر گھونسے مارتے
ہوئے لوٹ پوٹ ہو جاتے اور فرش پر پٹاپٹ بلغم کے انٹے تھوکنے لگتے
بڑھیا یہ دیکھ کر اور چڑھ جاتی۔ اور حلق پھاڑ پھاڑ کر کہتی "ہاں ہاں تھوڑے
دن اور ٹھیر جاؤ۔ پھر دیکھو۔ کیا ہونے والا ہے۔ یہ موٹا ایسے پھٹ پڑے گا۔ جیسے
چاولوں کا بورا"

اور آخر کار شرابیوں کے قہقہوں سے تنگ آکر وہاں سے رفو چکر ہو جاتی!

(۴)

خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ ایک دن توآں اتفاقیہ نزلہ زکام میں مبتلا ہوا۔ اور

اس کے سارے جسم پر فالج گر گیا۔ لوگوں نے اس بھاری بھرکم انسان کو اٹھا کر کیفے سے بالکل ملحق ایک چھوٹے سے کمرے میں ڈال دیا۔ تاکہ وہ کم سے کم دیوار کے دوسری طرف ہنگامے سن سکے اور اپنے دوست احباب سے بات چیت کر سکے۔ اس کے دماغ پر فالج کا اثر بالکل نہیں ہوا تھا۔ ہاں البتہ اس کا پورا جسم بیکار ہو گیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید کچھ عرصہ بعد اس کے موٹے موٹے بازوؤں میں کچھ نہ کچھ طاقت واپس آجائے گی اور وہ انہیں حرکت دے سکے گا۔ لیکن ایسی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اب وہ بیچارا بستر پر پڑے پڑے دن رات گذارا کرتا تھا۔ صرف ہفتہ میں ایک بار اس کے چار مشٹنڈے دوست اس کا ہاتھ پاؤں پکڑ کر اٹھاتے۔ تاکہ اس کا بستر تبدیل کر دیا جائے۔ وہ اتنی لاچاری کے باوجود بھی ہر وقت ہشاش بشاش رہتا تھا۔ لیکن اس کی زندہ دلی میں تھوڑی سی بزدلی کی حد تک انکساری کی جھلک آگئی تھی۔ اپنی بیوی کے سامنے تو وہ بالکل بچوں کی طرح دبکا دبکا رہتا تھا اور وہ ہر وقت اسے ڈانٹ پھٹکار بتلاتی رہتی تھی۔ "وہ دیکھو ——— کیسے پڑا ہوا ہے مٹکا! نکما کہیں کا"۔ وہ طعنے دیتے ہوئے چلاتی۔ تو ہاں چپ چاپ پڑا رہتا تھا اور کوئی جواب نہ دیتا۔ جب وہ گھرکیاں دیتی رہتی۔ تو اس کی نظریں بچا بچا کر آنکھیں مٹکایا کرتا اور بستر پر ایک پہلو سے دوسرے پہلو کروٹ بدل لیتا تھا۔ صرف یہی ایک جسمانی حرکت ایسی تھی۔ جسے وہ کر سکتا تھا۔ کروٹ بدلتے وقت کہا کرتا تھا۔ ——— "دیکھنا بھائی ذرا شمال سے جنوب جا رہا ہوں یا جنوب سے شمال جا رہا ہوں"۔ اس کی ساری دلچسپی بس اب یہ رہ گئی تھی۔ کہ بستر پہ پڑے پڑے دیوار کی دوسری طرف کیفے میں لوگوں کی گفتگو کی آوازیں سنتا رہتا۔ اور جب کوئی آشنا آواز سنائی دیتی۔ تو وہیں سے پکارتا ——— "ہلو بیٹا ——— اتم بول رہے ہو کیا؟" اور بیٹا وہاں سے جواب دیتے ——— "ہاں میں ہوں چچا تو ہاں، کہو کیا حال ہے؟ آج کتنی بار اچھل پھاند کی ہے میرے خرگوش؟"

"میں ابھی اچھل پھاند نہیں کر سکتا بیٹیا! نوآں جواب دیتا۔ لیکن میں دبلا بھی نہیں ہو رہا ہوں۔ بھلا بیماری میری چربی تھوڑے ہی پگھلا سکتی ہے"؟ پھر وہ اپنے دوستوں کو اپنے کمرے میں بلا لیتا۔ بنا دوست احباب اور ہا ہو کے اسے شراب پینے میں لطف نہ آتا تھا۔ وہ کہا کرتا۔ "مجھے کسی چیز کا افسوس نہیں ہے۔ اگر رنج ہے تو بس اس بات کا کہ میرے بیٹو! میں تم لوگوں کے ساتھ اتنی آزادی سے شراب نوشی نہیں کر سکتا"۔

اتنے میں کھڑکی میں سے مادام نوآں کا سر برآمد ہوتا دکھائی دیتا اور وہ یہ منظر دیکھ کر برس پڑتی "نکمے۔ اپاہج۔ پڑا ہوا ہے بستر پر اور پھر بھی سستی نہیں جاتی۔ مجھے تو ایسے کھلانا پڑتا ہے جیسے سور کو"۔

جب وہ چلی جاتی۔ تو بعض اوقات کھڑکی کے منڈیر پر کھڑا ہوا ایک موٹا تازہ مرغا دیدے گھماتے ہوئے بڑی زور سے ککڑوں کوں ککڑوں کوں کی صدائیں لگانے لگتا کبھی کبھی دو تین مرغیاں اندر کمرے میں کڑکڑاتی ہوئی پہنچ جاتیں۔ اور نوآں کے پلیٹ میں سے گرے ہوئے دانوں کو پنجوں سے کھرچ کر چلنے لگتیں۔

نوآں کے دوستوں نے بہت جلد کیفے میں بیٹھنا ترک کر دیا اور روزانہ دوپہر میں اس کے کمرے میں گپیں ہانکنے کے لئے اس کے بستر کے اردگرد اکٹھا ہو جاتے تھے۔ نوآں اس بیماری کی حالت میں بھی ان کی دلچسپی کا مرکز تھا۔ وہ طبیعت کا اتنا خوش مزاج واقع ہوا تھا کہ روتوں کو بھی ہنسا دیتا تھا۔ اس کے تین دوست تو ایسے تھے۔ جو بلاناغہ روزانہ آیا کرتے تھے۔ ایک تو سالیشیں تھا۔ جس کا قد لمبا تھا اور بالکل سیب کے درخت کے تنے کی طرح اینٹھا ہوا تھا۔ دوسرا آدم سلادیل تھا۔ جو بالکل سوکھا ہوا ڈبلا تھا۔ اس کی ناک نیولے کی طرح لمبی تھی۔ اور طبعاً لومڑی کی طرح چالاک تھا۔ تیسرا دوست سسرپوپل تھا جو منہ سے ایک لفظ نہ نکالتا تھا۔ اور چپ چاپ مذاق کا لطف اٹھاتا رہتا تھا۔

یہ لوگ اپنے ہمراہ ایک میز نما چھوٹا سا تختہ لاتے تھے۔ جسے ترچھا کر کے توآں کے بستر پر رکھ دیتے تھے۔ اور اسی تختہ پر دوپہر سے لے کر شام تک تاش کھیلا کرتے تھے لیکن توآں کی بیوی نے ان کے کھیل میں فوراً مداخلت شروع کر دی۔ اس سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ کہ اس کا شوہر بستر پر پڑے پڑے تاش کھیل کر اپنا وقت دو گھڑی ہنس بول کر کاٹ لے۔ جیسے ہی وہ انہیں کھیلتا ہوا پکڑ لیتی شیرنی کی طرح جھپٹ کر تختہ الٹ دیتی اور تاش کے پتے نوچ کر فرش پر بکھیر دیتی اور کہتی ——— "یہی کیا کم ہے۔ کہ میں اتنی محنت مزدوری کر کے اس نکھٹو کا پیٹ چلا رہی ہوں" تو آں اس طوفان کے دوران میں سر جھکا کر چپ ہو جاتا۔ لیکن آدرسلادیل کو اس عورت کو تنگ کرنے اور چھیڑ خانی کرنے میں مزا آتا تھا۔ ایک دن اس کو تنگ کرنے کی نیت سے اس نے کہا۔

——— "ہیلو مادام توآں! تم جانتی ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کیا کرتا؟" وہ الو کی طرح آنکھیں لگائے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ——— "تمہارا میاں دن رات بستر پر پڑے پڑے بھٹی کی طرح گرم ہو گیا ہے۔ میں تو اس کا فائدہ یوں اٹھاتا کہ اسے مرغی کے چوزے نکالنے کے لئے انڈے پر بٹھا دیتا"

وہ کچھ نہ بولی۔ اور سمجھی کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ اس چالاک کسان کے چہرے کو وہ برابر تک رہی تھی۔ اور وہ بولے جا رہا تھا "اس کی ترکیب یہ ہے کہ پانچ پانچ انڈے لے کر توآں کے دونوں بغلوں کے نیچے رکھ دو۔ اور اسی دن پہلی والی مرغی کو بھی انڈوں پر بٹھا دو۔ دونوں جگہوں کے انڈوں سے ایک ہی وقت میں چوزے نکل آئیں گے۔ اور جب چوزے نکل آئیں تو توآں کے بغلوں کے نیچے سے نکلے ہوئے چوزوں کو مرغی کے چوزوں کے ساتھ کر دو۔ جو انہیں ایک ساتھ چگا یا کرے گی۔ مادام توآں اس طرح تمہارے انوکھے مرغی خانے سے بڑا فائدہ ہو گا۔"

بڑھیا نے یہ سن کر خوشی سے تالی پیٹتے ہوئے کہا ——— "کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟"

آورسلاویل نے جواب دیا ——— "کیوں نہیں؟ اگر بند ڈبوں میں انڈے رکھ کر چوزے نکالے جا سکتے ہیں۔ تو گرم بستر میں بھی رکھ کر نکالے جا سکتے ہیں۔"

وہ اس منطق سے بہت متاثر ہوئی۔ اور کچھ سوچتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ آٹھ دن بعد وہ ایک برتن میں انڈے لئے ہوئے تو آں کے پاس آئی۔ اور کہنے لگی۔

"دیکھو آج میں نے پیلی والی مرغی کو اس کے انڈوں پر بٹھا دیا ہے اور یہ دس عدد انڈے تمہارے نیچے رکھنے کے لئے لائی ہوں۔ احتیاط سے رکھ لو۔ توڑنا مت!"

تو آں نے حیرت سے پوچھا ——— "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ان انڈوں سے چوزے تم نکالو گے۔ نکموں کی طرح کاہل پڑے رہتے ہو۔ کم سے کم یہی کام انجام دو۔"

تو آں پہلے تو اسے مذاق سمجھ کر ہنسا۔ لیکن جب اس نے اصرار کرنا شروع کیا تو خفا ہو گیا۔ اس نے انڈوں کو اپنی موٹی باہوں کے نیچے رکھنے اور سینے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ یہ سن کر وہ بہت ناراض ہو گئی۔ اور کہنے لگی ———

"اگر تم انکار کرو گے تو تمہارا کھانا پانی بند کر دیا جائے گا۔ اور اس وقت تک تم کو روٹی نہ ملے گی۔ جب تک تم انڈے سینے پر تیار نہ ہو جاؤ۔"

تو آں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب بارہ کا گھنٹہ بجا تو اس نے بھوک سے بیتاب ہو کر اپنی بیوی کو آواز دی۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے باورچی خانے سے جواب دیا ——— نکمے آدمی! تم کو کھانا نہیں دیا جائے گا!"

پہلے تو اس نے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ

اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے۔ تو گڑگڑا کر عاجزی اور خوشامد کرنے لگا ــــــــ
"شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال ہونے لگا"۔ کھانے کی بھینی بھینی خوشبو
سونگھ سونگھ کر اور بھوک سے بیتاب ہو کر دیوار پر گھونسے مارنے لگا۔ آخر کار جب
تھک کر نڈھال ہو گیا۔ تو مجبور ہو کر انڈوں کو اپنی بغلوں کے نیچے رکھنے کی اجازت
دے دی۔ جب انڈے رکھ دیئے گئے۔ تب اس کی بیوی نے اسے سوپ پینے کے
لئے دیا۔ حسب معمول اس کے دوست ملنے آئے تو توآں صورت سے بالکل "پژمردہ
اور بیمار نظر آ رہا تھا۔ اور کرب و بے چینی کے عالم میں دکھائی دیتا تھا۔ روزانہ کی
طرح وہ تاش کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن توآں کا دل کھیل میں بالکل نہیں لگ رہا
تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے اپنا بازو ہلا رہا تھا۔ اس کی اس احتیاط کو دیکھ کر اس کے
دوستوں کو کچھ شبہ ہوا۔ آور سلاویل نے پوچھا "کیوں کیا تمہارے بازوؤں
میں کچھ تکلیف ہے؟"

توآں نے جواب دیا ــــــــ "ہاں ــــــــ ! بازو کچھ بھاری بھاری
سے معلوم ہو رہے ہیں"۔

اِتنے میں کیفے میں کچھ لوگ آ گئے۔ اور توآں کے دوست احباب ان سے گفتگو
کرنے کے لئے باہر کے کمرے میں چلے گئے۔ ان نو واردوں میں ایک نوشہر کی میونسپلٹی کا
چیئرمین تھا۔ اور دوسرا ممبر۔ انہوں نے دو گلاس شراب کا آرڈر دیا اور سیاسی
گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

چونکہ ان کی آواز صاف سنائی نہ دے رہی تھی۔ اس لئے توآں نے بستر پر
ذرا سا آگے کو سرک کر دیوار سے کان لگا دیا۔ تاکہ ان کی گفتگو سن سکے۔ اس طرح "شمال
سے جنوب" ہوتے ہوئے اسے بغل کے نیچے انڈوں کی موجودگی کا بالکل خیال نہ رہا اور
اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف کے بغل کے نیچے رکھے ہوئے انڈوں کا آملٹ

بن گیا۔

یہ دیکھ کر توآں کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور اس کی آواز سن کر مادام توآں دوڑتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ اسے کچھ شبہ سا ہوا۔ اور اس نے جھٹکے کے ساتھ توآں کے جسم پر سے چادر کھینچ لی۔ توآں کے پہلو میں بستر پر انڈوں کی پیلی زردی کا پلاسٹر پھیلا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر پہلے تو وہ غصہ کے مارے گم سم ہوگئی۔ پھر غصہ سے تھرتھراتے ہوئے وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس طرح توآں کے جسم کو پھٹکارنے لگی جیسے وہ دریا کے کنارے غلیظ کپڑوں کو پھٹکارا کرتی تھی۔ پھر اس نے گھونسوں اور مکّوں کی بارش اس طرح شروع کردی جیسے تاشہ پیٹا جا رہا ہو۔

توآں کے دوست احباب یہ منظر دیکھ کر ہنسی کے مارے بدحال ہوگئے اور اس پٹائی کی وجہ دریافت کرنے لگے۔ بے چارا توآں گھبرایا ہوا بارش کی طرح برستے ہوئے مکوں اور گھونسوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے جسم پر وصول کر رہا تھا۔ تاکہ کہیں اس دھینگامشتی میں دوسری بغل میں رکھے ہوئے باقی ماندہ پانچ انڈوں کا بھی آملیٹ نہ بن جائے۔

(۳)

آخر کار توآں کو ہار ماننی پڑی۔ اور وہ ان انڈوں کو بالکل مرغیوں کی طرح احتیاط سے سینے پر مجبور ہو گیا۔ اسے تاش کا شغل بھی ترک کرنا پڑا۔ اور اس نے شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال ہونا بھی چھوڑ دیا۔ اسے بڑی احتیاط سے پڑا رہنا پڑتا۔ اس لئے کہ جس روز اس کی بد احتیاطی سے کوئی انڈا ٹوٹ جاتا۔ تو اس روز اس کی بیوی ایک وقت کا کھانا بطور سزا بند کر دیتی۔ وہ بالکل بے حس و حرکت اپنے دونوں بازوؤں کو پر کی طرح پھیلائے ہوئے چت لیٹا رہتا اور چھت کو گھورتا رہتا۔ اور سفید خولوں میں بند مرغی کے چوزوں کو گرمی پہنچایا کرتا تھا۔

وہ بہت دھیمی آواز میں بولتا تھا۔ تاکہ کہیں آواز کی ادائیگی کی وجہ سے کوئی غیر موزوں حرکت سرزد نہ ہو جائے۔ پیلی والی مرغی کی بابت وہ اکثر دریافت کرتا رہتا تھا جو ڈربہ میں وہی خدمت انجام دے رہی تھی۔ جو وہ بستر میں انجام دے رہا تھا۔ مادام توآں اکثر و بیشتر شوہر کے پاس سے دوڑتی ہوئی مرغی کے پاس جاتی تھی اور مرغی کے پاس سے دوڑتی ہوئی شوہر کے پاس آتی۔ اور ان انڈوں کی دیکھ بھال کرتی رہتی تھی۔ جو ڈربہ اور بستر میں بہ وقت واحد سے جا رہے تھے۔ گاؤں والوں کو جب اس غریب و عجیب واقعے کی خبر ہوئی۔ تو اس استثناء قدرت کو دیکھنے کے لئے جوق در جوق جمع ہونے لگے۔ وہ دبے دبے پاؤں بڑی احتیاط سے توآں کے کمرے میں ایسے داخل ہوتے تھے جیسے کسی مریض کے کمرے میں داخل ہو رہے ہوں۔ اور بڑی حیرانگی سے پوچھتے تھے ——— "کیوں توآں! اب کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے" ——— وہ جواب دیتا۔ "چوزے تو دن پورے ہونے پر نکل ہی آئیں گے۔ لیکن نہ جانے یہ وقت کب پورا ہوگا۔ میں تو اب بالکل عاجز آگیا ہوں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے سارے جسم میں ٹھنڈک سمائی جا رہی ہو۔"

ایک دن صبح سویرے اس کی بیوی جھلاتی ہوئی آئی۔ اور کہا ———

"دیکھو آج پیلی والی مرغی نے سات چوزے نکال دئے۔ صرف تین عدد انڈے گندے نکلے ہیں۔"

یہ خبر سن کر توآں کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ نہ جانے وہ کتنے چوزے پیدا کرنے میں کامیاب ہوگا؟

"معلوم ہوتا ہے میرا وقت بھی قریب آگیا ہے"۔ اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے کوئی عورت بچہ جننے سے پہلے کہتی ہو۔

مادام تو آں نے کچھ مایوسانہ انداز میں کہا ——— "ہاں - اب قریب ہی معلوم ہوتا ہے"۔

اور وہ انتظار کی گھڑیاں گننے لگے۔

دوست احباب یہ جان کر کہ تو آں کا وقت بھی قریب آ رہا ہے بڑی بے چینی محسوس کرنے لگے۔ ہر گھر میں اسی کے چرچے ہونے لگے اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ گھڑی گھڑی کی خبر کا اعلان ہونے لگا۔ تین بجے کے قریب تو آں کو کچھ بے ہوشی سی معلوم ہونے لگی - وہ بڑی دیر تک غنودگی کے عالم میں پڑا رہا۔ یکایک اس کی آنکھ کھل گئی - اور اسے اپنے بازوؤں کے نیچے کچھ گدگدی محسوس ہوئی - اس کے سارے جسم میں میٹھا میٹھا سا درد محسوس ہونے لگا - اور اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی - اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ بغل کی طرف ہاتھ کھسکایا اور ایک ننھا منا سا چوزا اس کی انگلیوں کے بیچ کلبلانے لگا۔ وہ مسرت سے چیخ اٹھا - اور ننھے منے سے چوزے کو نکال کر باہر چھوڑ دیا۔ چوزا باہر نکل کر اس کے سینے پر چڑھ گیا اور پھدکنے لگا۔ اس وقت کمرے میں اتنے آدمی بھرے ہوئے تھے کہ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی - سارے لوگ دوڑ کر اس کے کمرے میں پہنچے - اور چاروں طرف سے اس کے بستر کو گھیر لیا۔ اس کی بیوی سب سے پہلے دوڑتی ہوئی وہاں پہنچی - اور اس نے احتیاط کے ساتھ چوزے کو اٹھا لیا - جو اس وقت اس کے شوہر کی داڑھی میں الجھ گیا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی - اپریل کا ایک گرم دن تھا - اور کھڑکی میں سے باہر کی طرف سے پیلی والی مرغی اور اس کے چوزوں کی کٹ کٹانے کی آواز آ رہی تھی - بے چینی کی وجہ سے تو آں کے ماتھے پر پسینہ چھوٹ رہا تھا - اتنے میں اس نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے اپنے بائیں بازو کے نیچے ایک اور ولادت محسوس ہو رہی ہے"۔

اس کی بیوی نے ایک دائی کی سی احتیاط سے اپنے بڑے بڑے لاغر ہاتھ

چادر کے نیچے گھسیڑ دیئے۔ اور بغل کے نیچے سے ایک اور چوزہ نکال دیا۔

لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اس کو بڑے تعجب سے دیکھنے لگے۔ ایسے جیسے یہ قدرت کا کوئی اہم کرشمہ ہو۔ ۲۰ منٹ تک پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ اس کے بعد چار چوزے ایک ساتھ انڈوں کے باہر نکل آئے۔ یہ منظر دیکھ کر تو لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

توآں مسکرانے لگا۔ وہ اپنی کامیابی پر بڑا مسرور اور شادماں نظر آرہا تھا۔ اور اپنی قوتِ تولید پر بڑا فخر محسوس کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا فخر بالکل بجا تھا۔ اس لیئے کہ اس کوشش میں حضرتِ مرغ کا کوئی حصّہ نہ تھا اور یہ کامیابی سراسر اس کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھی۔

ایسا عجیب و غریب منظر پہلے کبھی آنکھوں کے سامنے سے نہیں گذرا تھا۔

وہ بڑا مسخرہ تھا "یہ ملا کر چھ ہوگئے" ——— توآں نے کہا ——— "کیا کیا نام رکھے جائیں گے ان بچوں کے؟" یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ کیفے میں ایک جمِ غفیر جمع ہوگیا تھا۔ اور لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر اس منظر کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کتنے بچے پیدا ہوئے؟"

"ابھی تک تو چھ عدد پیدا ہو چکے ہیں۔"

مادام توآں ان چوزوں کو سمیٹ کر دوڑی ہوئی پیلی والی مرغی کے پاس گئی۔ اور اس کے سامنے چھوڑ دیا۔ اس نے کڑکڑاتے ہوئے اپنے پر پھیلا دیئے۔ اور ان مزید بچوں کو بھی اپنی آغوشِ مادری میں سمیٹ لیا۔

"ایک اور آرہا ہے"۔ توآں نے کہا۔ اس نے غلط کہا۔ ایک کی بجائے تین چوزے نکل پڑے۔ سب سے آخری چوزے کی ولادت شام کے سات بجے

ہوتی - تو آں کا کوئی انڈا بھی گندا نہ نکلا - وہ خوشی سے پاگل ہو گیا اور اس نے چوزے کو پکڑ کر اس کی پوٹ کو بے تحاشا چومنے لگا۔

اس کا جوش مادری زور کرنے لگا اور اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اس چوزے کو دوسرے دن تک اپنے پاس ہی بستر میں رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن مادام تو آں نے اس کی مادرانہ محبت کا کوئی خیال نہ کیا - اور اس چوزے کو بھی اٹھا کر لے گئی -

تو آں کے دوست احباب اس واقعہ کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

آور سلاویل سب سے پیچھے رہ گیا۔ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد اس نے تو آں سے کہا —— "کیوں چاچا! جب مرغیاں کٹیں گی تو دعوت میں ہم کو بھی بلاؤ گے نا؟"

مرغی کے کٹنے کے خیال پر تو آں کو ہنسی آگئی - اور اس نے کہا۔

ہاں - ہاں ضرور —— بیٹا!

Religion and woman

مذہب اور عورت

زمانہ قدیم میں شہر برانیزا میں ایک خدا رسیدہ یہودی پادری رہا کرتا تھا۔ جو علم وفنون اور عقل ودانش میں زمانہ میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ لیکن اسکی شہرت کا باعث اس کے خوفِ خداوندی اور زہد وعبادت سے زیادہ اس کی خوبصورت بیوی تھی۔ سارا عالم اس کے حسن وجمال پر فریفتہ تھا۔ اور مشہور ومعروف ماہر توریت کی بیوی ہونے نے اس کی شہرت میں اور بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔ عموماً یہودی علماء اور فلسفیوں کی بیویاں اصولاً یا تو انتہائی بدصورت ہوا کرتی تھیں۔ یا ان میں کوئی نہ کوئی جسمانی نقص ہوا کرتا تھا۔ صفحات آسمان میں اس قاعدہ کلیہ کی تشریح یوں کی گئی تھی۔ کہ انسانوں کے جوڑے خداوند تعالےٰ خود بنا دیتا ہے۔ جیسے ہی کوئی لڑکا عالم وجود میں آتا ہے۔ آوازِ غیبی اس کی ہونے والی شریک حیات کے نام کا اعلان کر دیتی ہے اسی طرح جب لڑکی کی ولادت ہوتی ہے تو اس کے آئندہ ہونے والے شوہر کے نام کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح ایک دانشمند

انسان اچھی چیزیں باہر کام میں لاتا ہے۔ اور گھر میں پرانی فرسودہ چیزوں سے کام نکال لیتا ہے۔ اسی طرح خداوند ان عورتوں کو بے چارے پادریوں کے سر منڈھ دیتا ہے۔ جن کو قبول کرنے کے لئے کوئی مرد تیار نہیں ہوتا ہے۔

مگر خلاف معمول اس پادری پر ایک حور نازل کر دی گئی تھی۔ شاید اس فعل سے دنیا کو یہ دکھانا مقصود تھا۔ کہ قدرت کے کرشمے لاثانی ہیں۔ اور خداوند قانون قدرت میں استثنا بھی پیدا کر سکتا ہے۔ پادری کی بیوی اتنی خوبصورت تھی۔ کہ یا تو اسے کسی بادشاہ کی ملکہ ہونا چاہئے تھا یا کسی آرٹ گیلری کی زینت۔ کشش نفسانی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کا سر نہایت خوبصورت تھا اور مغرور کاندھوں پر کالی کالی دراز زلفیں سانپ کی طرح لہراتی رہتی تھیں۔ لمبی لمبی دراز گھنی پلکوں کے نیچے دو بڑی بڑی کٹوری ایسی آنکھیں چمکتی رہتی تھیں۔ اور اس کے ہاتھ تو اتنے ملائم اور سفید تھے کہ ہاتھی دانت کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

اس حسن کی دیوی کو تو قدرت نے اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ زیب تخت و تاج ہوتی۔ غلام اس کے پیروں پر لوٹتے ہوتے۔ مصوّر اس کے حسن و جمال کو صفحہ قرطاس پر مرتب کرتا رہتا۔ اور بت تراش اس کے مجسّمے کو تراشتا رہتا۔ لیکن یہ بدنصیب اپنے ناموزوں ماحول میں اس پھول کی طرح سر جھکا کر رہ گئی تھی۔ جسے کلی نے دبوچ لیا ہو۔ وہ تمام دن قیمتی شال سے اپنے جسم کو لپیٹے ہوئے کھڑکی کے پاس بیٹھی رہتی اور خوش خوابی میں مبتلا رہتی۔

ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کا شوہر صبح سے شام تک زہد و عبادت میں مشغول رہتا اور توریت کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ وہ گھر کے کام دھندے سے بالکل انجان رہتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک رئیس کی بیوی تھی۔ گھر کا کاروبار بالکل اس گھڑی کی طرح

چلتا رہتا تھا۔ جس کو ہفتہ میں ایک بار چابی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ گھر کے باہر کبھی نہ نکلتی تھی۔ اور نہ اس سے کوئی ملنے جلنے آتا تھا۔ بس دن بھر بیٹھی جمائیاں لیا کرتی تھی۔

ایک دن بڑے زور کا طوفان آیا۔ اور جب برق و باراں کے تھم جانے کے بعد امن و سکون ہوا۔ تو یہودی ملکہ حسن و جمال معمول کی طرح شال اوڑھے آرام کرسی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور باوجود گرم کپڑوں کے سردی سے تھر تھرا رہی تھی۔ یکایک وہ اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ جو قریب ہی جائے نماز پر بیٹھا جھوم جھوم کر توریت پڑھ رہا تھا۔

"یہ بتاؤ کہ کیا واقعی حضرت داؤد کے بیٹے حضرت موسےٰ اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائینگے؟" ——— اس نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں! وہ ضرور ظہور پذیر ہونگے۔ یہ ہمارا ایمان ہے"۔ فلسفی نے جواب دیا۔ توریت میں خدا نے فرمایا ہے کہ دنیا میں اس وقت ان کا ظہور ہوگا۔ جب کہ تمام کی تمام نسل یہود یا تو پاک ہو جائے گی یا ساری کی ساری بدکار اور گنہگار ہو جائے گی"۔

"کیا تمہارا خیال ہے کہ کبھی بھی ساری کی ساری نسل یہود بالکل پاک ہو جائیگی؟"

"بھلا ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" پادری نے جواب دیا۔

"تب تو موسےٰ اسی وقت ظہور پذیر ہونگے۔ جب کہ ہم سب کے سب گنہگار اور بدکار ہو جائیں گے"۔

یہ سن کر پادری نے کاندھے جھٹکا دیئے۔ اور پھر تلاوت توریت میں مشغول ہو گیا۔ ملکہ حسن نے خواب آلودہ نگاہوں سے کھڑکی کے باہر برستے ہوئے پانی کے

تاروں کو دیکھا اور اپنی سفید انگلیوں سے شال کے نرم و گداز بالوں سے کھیلنے لگی۔
ایک دن پادری کو قریب کے گاؤں میں مذہبی نقطے کو سلجھانے کے لئے جانا پڑا۔ اپنی حکمت و لیاقت کی وجہ سے اس نے خلاف معمول اس مسئلے کو تھوڑے ہی وقت میں طے کر دیا۔ اور بجائے دوسرے دن لوٹنے کے وہ اسی روز شام کو اپنے ایک ہمعصر عالم دوست کے ساتھ لوٹ آیا۔ وہ اپنے دوست کے گھر پر ہی گاڑی سے اتر پڑا۔ اور پیدل چلتا ہوا اپنے گھر کے دروازہ پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ گھر کی تمام کھڑکیوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اور پھاٹک پر ایک فوجی افسر کا اردلی بیٹھا تمباکو پی رہا تھا۔
"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے کچھ تشویشناک مگر دوستانہ لہجہ میں پوچھا۔
"مَیں یہاں پہرہ دے رہا ہوں، کہ کہیں خلاف معمول ملکہ حسن یہودن کا پادری شوہر گھر نہ لوٹ آئے"۔
"واقعی؟ اچھا تو ہوشیاری سے پہرہ دیتے رہو"۔ یہ کہتے ہوئے وہ سامنے کی طرف بہانہ کر کے جانے لگا۔ لیکن گھوم کر بائیں باغ کے دروازے سے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ جب وہ پہلے کمرہ میں پہنچا۔ تو دیکھا کہ کھانے کی میز پر دو آدمیوں کے کھانے کا انتظام تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ابھی ابھی کوئی وہاں سے اُٹھ کر گیا ہے۔ حسب معمول اس کی بیوی شال میں لپٹی ہوئی خواب گاہ میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے گال بالکل سُرخ انگارے کی طرح لال تھے۔ اور اس کی کالی کالی آنکھوں میں اطمینان اور سکون کی جھلک تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بڑی بڑی آنکھیں اس کی طرف حقارت سے دیکھ رہی ہوں۔ اور قہقہے لگا رہی ہوں۔ اس کا پیر نیچے پڑی ہوئی کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ اس نے جھک کر روشنی میں دیکھا تو مردانے جوتوں

کی ایک جوڑی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

"یہاں پر تمہارے ساتھ کون تھا؟" پادری نے پوچھا۔

ملکہ حسن نے بڑی حقارت سے گردن موڑلی اور کوئی جواب نہ دیا۔

"میں جانتا ہوں۔ ابھی ابھی کیپٹن ہسارس تمہارے پاس موجود تھا۔"

"تھا تو کیا ہوا؟ کیا حرج ہے اس میں؟" اس نے بال وار شال میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"او عورت ——— ! تم اپنے ہوش میں جواب دے رہی ہو؟"

"میں بالکل ہوش میں ہوں۔" اپنے جذباتی ہونٹوں کو چباتے ہوئے اس نے کہا ——— "کیا میں یہودیوں کو بدکار اور گنہگار بنانے میں حصہ نہ لوں تاکہ جلد سے جلد حضرت موسےٰ کا ظہور ہو۔ اور تمام یہودیوں کی نجات ہو جاتے؟"

"Merdoon Ka Shikar"

مردوں کا شکار

اس رات باتوں ہی باتوں میں دونوں خواتین نے کافی سے زیادہ چڑھالی۔ ان میں ایک خاتون تو بروسن تھی اور دوسری کاونٹس۔ تنہائی سے اکتا کر دونوں نے رات کا کھانا ساتھ ساتھ مل جل کر اس کشادہ اور ہوادار کمرے میں نوش کیا تھا۔ جس کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں۔ سمندر کی خوشبو سے معطر ہلکی ہلکی تازہ ہوا کی لپٹیں کھلی ہوئی کھڑکی سے گذر کر اندر کی طرف لہرا رہی تھیں۔ دونوں نازنین مست جوانی اور خمار مئے سے مدہوش آرام کرسیوں پر ٹانگیں پھیلائے لیٹی ہوئی تھیں اور لیٹے لیٹے سگریٹ کے کشوں کے درمیان ہلکی ہلکی شراب کی چسکیاں لے رہی تھیں۔ اور ایسی سرگوشیوں میں مصروف تھیں جو صرف کیفیت مسرور ہی بہکے بہکے ہونٹوں سے ادا کر سکتی ہے۔

دوپہر میں ان کے شوہر ان سے رخصت ہو کر واپس پیرس گئے تھے اور اپنے جانتے میں اپنی بیویوں کو ایسے بنجر اور ویران مقام پر محفوظ چھوڑ گئے تھے۔

جہاں ان کی بیویاں کم سے کم ان رنگیلے نوجوانوں کی دسترس سے باہر تھیں جو بڑی بڑی اور مشہور تفریح گاہوں میں عموماً پائے جاتے تھے اور جن کی للچائی ہوئی نظروں سے اپنی بیویوں کو صحیح وسالم بچا لینا شوہروں کے لیے تقریباً ناممکن سا تھا۔ چونکہ وہ ہفتہ میں چھ دن کام کاج کے سلسلہ میں اپنی بیویوں سے جدا رہتے تھے۔ اس لیے انہیں یہ بات قطعی ناگوار گذرتی تھی۔ کہ ان کی بیویاں ان کی غیر موجودگی میں غیر مردوں کے ساتھ جنگلوں میں پکنک منائیں یا باغات کے پوشیدہ مقامات پر ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر بیٹھ کر نہایت بے تکلفی سے لنچ اڑائیں۔ یا تیراکی کے نت نئے اصولوں کی ٹریننگ حاصل کریں، یا غیر مردوں سے اس قسم کا ربط وضبط پیدا کریں جو ایام فرصت میں تفریح گاہوں کے رنگین ماحول میں عموماً پیدا ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے .... جیسے ارمان پرست جنت نظیر مقامات کو نہایت دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اور ایک دور افتادہ گمنام جگہ پر راکیویل کی ویران وادی میں اپنی بیویوں کو طویل موسم گرما کاٹنے کے لئے ایک سنسان مکان میں دفن کر دیا تھا۔

اس رات ان دونوں خواتین نے کافی سے زیادہ پی لی تھی۔ طویل تنہائی اور غیر رومانی ماحول سے اکتا کر انہوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ ایک دن زندگی میں ہل چل پیدا کرنے کے لئے ایک اچھا سا ڈنر خود اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھایا جائے اور اس کے بعد تمام شب شمپین سے دل بہلایا جائے۔ اپنے ہاتھوں سے سادا کھانا پکا کر کھانے میں انہیں بڑا لطف آیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ بڑے اطمینان سے آرام دہ کرسیوں پر لیٹ گئیں اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئیں اور ساتھ ہی ساتھ شراب سے اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد سرخ پری نے

اپنا جادو دکھانا شروع کر دیا۔ اور انہیں کچھ احساس نہ رہ گیا۔ کہ آخر وہ کیا بک رہی ہیں؟

کاونٹس نے اپنی ٹانگیں لمبی کر کے ایک کرسی کی پشت پر ٹکا رکھیں تھیں اور اس پر بہ نسبت اپنی سہیلی کے نشہ کچھ زیادہ طاری تھا۔ بروسن کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ایسی دلچسپ رات کے کامیاب اختتام کا ذرا مزا تو اس میں ہے کہ باقی رات کسی کی آغوش میں بسر کر دی جائے۔ کاش کہ اس وقت کوئی ہوتا۔ مجھے پہلے سے خیال نہ رہا۔ ورنہ میں پیرس سے اپنے جانے پہچانے دو نوجوان دوستوں کو بلا لیتی اور اپنی سخاوت کا ثبوت اس طرح دیتی کہ ان میں سے ایک کو تمہیں بخش دیتی"۔

"میرے لئے مردوں کی کوئی قلت نہیں" ——— دوسری نے جواب دیا۔

"میں جب چاہوں اور جہاں چاہوں ——— بلکہ اسی رات اسی وقت اگر چاہوں تو ایک مرد سے ———"

"پاگل ہوئی ہو؟ یہاں ——— راوکیل جیسے ویرانہ میں اور مرد؟ ڈیر! اگر ہو بھی تو کوئی گنوار ہو گا ———"

"اوہوں ——— گنوار نہیں"!

"تو اور کون ہے؟ ——— بتاؤ نا"!

"کیا بتاؤں"؟

"بھلا اس ویرانے میں کون تمہارا عاشق ہے"؟

"مائی ڈیر! ——— میں تو بغیر پیار محبت کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ جس روز اس دنیا میں مجھے کوئی چاہنے والا نہ رہے گا۔ اس روز میں بھی زندہ نہ رہونگی"۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ میں بھی زندگی میں بنا عاشق کی موجودگی کے زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"ٹھیک ہے بالکل ٹھیک!"

"مگر ——— ان نکمّے مردوں کے دماغ میں اتنی موٹی سی بات بھی نہیں گھستی۔ اور شوہروں کی عقل پر جیسے پتھر پڑ گئے ہوں"۔

"درست ——— بالکل درست! ہم عورتیں ہمیشہ ایسی محبت کی بھوکی اور متلاشی رہتی ہیں۔ جس کے میٹھے میٹھے پریم بھرے گیت ہوں۔ شراب کا نشہ ہو اور بہار کی جوانی ہو۔ محبت کے دوران میں عاشق مزاج۔ بانکے نوجوان ہمیں ہمیشہ تنگ کرتے ستاتے رہیں اور گدگدیاں لیتے رہیں۔ یہی پیار محبّت ہمارے دلوں کی ٹھنڈک ہے۔ ہماری زندگی کی رُوح ہے۔ اس کے بغیر ہماری زندگی بیکار ہے"!

"سچ کہتی ہو ڈارلنگ"!

"میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ہمیشہ میری یادوں کی مالا جپتا رہے۔ مجھ پر دیوار وار فدا ہو۔ اور میں ہمیشہ کسی کے سپنوں کی رانی بنی رہوں۔ سوتے جاگتے۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ غرض کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی میرے لئے تڑپتا رہے۔ آہیں بھرتا رہے۔ اور میرے وصل کے خواب دیکھتا رہے۔ جس روز میرے چاہنے والے نہیں رہ جائیں گے۔ اس روز میری زندگی پھیکی پڑ جائے گی۔ اس پھول کی طرح بے جان جس میں رنگ و بُو نہ رہی ہو۔ میرے لئے تو سوائے آنسو بہانے کے دنیا میں کوئی چارہ نہ رہ جائیگا"!

"میں تمہاری ہم خیال ہُوں"۔

اِس دُنیا میں ہر شادی کا حشر یہی ہوتا ہے کہ اوائل چھ ماہ تک تو شوہر بہت ہی محبت اور التفات سے پیش آتا ہے یا زیادہ سے زیادہ سال دو سال تک۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا رویہ نہایت خود غرضانہ ہوتا جاتا ہے۔ پہلے کی بہ نسبت وہ بالکل

تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور پھر سب کچھ اپنی ہی حرص اور تفریح کے لئے کرتا ہے۔ روزمرّہ کے معاملات میں ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتا ہے۔ بلکہ کوئی بات نہ ہو تو بھی چڑ جاتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو ——— کہ آخر ایک مرد کے ساتھ تمام عمر کس طرح پیار، محبت قائم رہ سکتے ہیں؟"

"کبھی نہیں! بالکل ناممکن ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہتی ہو"

"کیا ٹھیک کہتی ہوں؟ میں کیا ٹھیک کہہ رہی ہوں ——— اُف ——— مجھے کچھ خیال نہیں کہ میں کیا کہہ رہی تھی؟"

"تم کہہ رہی تھیں کہ سارے شوہر خود غرض ہوتے ہیں"۔

"ہاں۔ ہاں ——— سب کے سب"

"ہاں۔ ہاں!"

"اچھا تو پھر ———؟"

"ہوں"

"اوہو ——— میں کیا کہہ رہی تھی؟ میں کیا کہنے والی تھی؟"

"میں کیا جانوں! تم نے یہ تو بتایا نہیں تھا۔ کہ تم کیا کہنے والی ہو"۔

"لیکن میں تم سے کچھ کہہ رہی تھی!"

"ہاں۔ ہاں۔ تم کہہ رہی تھیں کہ ——— کہ ———"

"ہاں۔ مجھے یاد آگیا"

"تو کہو!"

"——— تو میں کہہ رہی تھی کہ میرے لئے مردوں کی کوئی قلت نہیں۔ بس جب چاہوں۔ جہاں چاہوں۔ جس مرد کو چاہوں۔ پھانس لیتی ہوں"۔

"بھلا وہ کیسے"؟

"وہ اس طرح کہ ——— ذرا کان دھر کر سنو! جب میں کسی نئے مقام پر پہنچتی ہوں۔ پہلے وہاں کے تمام مردوں کے نہایت غور و خوض سے جایزے لیتی ہوں۔ پھر ان میں سے کانٹ چھانٹ کر کے اپنی پسند کا ایک عاشق چن لیتی ہوں"۔

"تم اپنی پسند کا عاشق چن لیتی ہو"؟

"ہاں۔ اپنی پسند کا۔ میرے انتخاب کی سب سے پہلی شرط تو یہ ہوتی ہے۔ کہ میرے ہونے والا عاشق نوجوان ہو۔ اور خوبصورت ہو۔ پھر مالدار ہو اور ساتھ ہی ساتھ شاہ خرچ بھی ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا"؟

"یس۔یس"۔

"اس کے علاوہ اس میں اعلےٰ قسم کی مردانہ خصوصیات بھی ہوں"۔

"بہت ضروری ہے"۔

"ان سب چیزوں کو اچھی طرح پرکھ لینے کے بعد میں اپنے ہونے والے عاشق کے سامنے چارہ لگا کر کانٹا ڈال دیتی ہوں"۔

"کانٹا؟ ——— چارہ لگا کر کانٹا ———"؟

"ہاں کانٹا ——— ! جیسا مچھلی پکڑنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کیا تم نے کبھی مچھلی کا شکار نہیں کھیلا"؟

"اوہوں"۔

"ارے بڑا مزا آتا ہے مچھلی کے شکار میں اور ساتھ ہی ساتھ بڑا تجربہ بھی ہوتا ہے۔ اچھا تو پھر چارہ لگا کر کانٹا چھوڑ دیتی ہوں"۔

"آخر کس طرح"؟